تخابات

اور
سلمانانِ ہند

مکتبہ جماعت اسلامی ہند
رام پور۔ یو۔ پی

مسئلۂ انتخابات

اور

مسلمانانِ ہند

حصہ اوّل

مولانا ابواللیث اصلاحی

مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند
رام پور - یو - پی

بارِ اوّل ـــــــ اکتوبر ۱۹۵۱ء

تعدادِ اشاعت ـــــــ ایک ہزار ۱۰۰۰

مطبوعہ ـــــــ ناظم پریس رامپور

قیمت ـــــــ چودہ آنے
۱۴ر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمان جس حالت میں زندگی گذار رہے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو ہر طرف سے ایسے احوال و مسائل نے آگھیرا ہے کہ اگر اس موقع پر ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ یہ قوم ایک طرف اس ملک کے لیے وبالِ جان بن جائے گی جس میں وہ رہ رہی ہے ——— کیونکہ اس وقت اس قوم کی سب سے نمایاں خصوصیت، مایوسی و اضطراب اور احساسِ کمتری ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے چار کروڑ سے زائد اشخاص پر اس قسم کی حالت کا طاری ہونا اس ملک کے حال و مستقبل کے لیے کوئی خوش گوار علامت نہیں ہے ——— اور دوسری طرف یہ قوم ان حالات میں گھر کر رفتہ رفتہ اسلام اور اپنی ملّی خصوصیات سے بھی بالکل کوری ہو جائے گی۔ جس کے بعد اگر یہ باقی بھی رہی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا وجود و فقدان دونوں برابر ہوگا۔

مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے رہنمایانِ ملّت کا فرض تھا کہ وہ اس موقع پر آگے بڑھتے اور اتنی بڑی قوم کو یوں تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے لیکن یہ دیکھ کر ہمارا دل خون ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ حقیقتاً اس کے اہل بھی ہیں وہ یا تو خود مایوسی کا شکار ہو کر گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں یا اگر ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر رہنمائی کا کام انجام دینا چاہتے ہیں تو وہ بالعموم اصلاح کے ایسے نسخے تجویز کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے اصل مرض اور اس کے علاج سے کوئی حقیقی تعلق نہیں رکھتے

ان کا مقصد یا تو دفع الوقتی ہے کہ ان کے خیال کے مطابق جب یہ قوم مر ہی رہی ہے تو

علاج و معالجہ سے فائدہ کیا ہے یا ان میں مریض کے مزاج اور اصل حالت سے زیادہ ماحول اور موسمی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لیے یہ تو ممکن ہے کہ وقتی طور سے ان نسخوں سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہونچ جائے لیکن جہاں تک اصل مرض کا تعلق ہے وہ ان نسخوں کے بعد بھی شاید جوں کا توں باقی رہ جائے اور اس لیے جو خطرات اس مریض کو درپیش ہیں وہ زود یا بدیر پھر سامنے آکر رہیں - اور یہ صورتِ حال ہمارے لیے اور زیادہ قلق افزا ہے کیونکہ کچھ نہ ہونے کی حالت میں تو مریض کو اپنی صحت کی کم از کم فکر ہی ہو سکتی ہے لیکن اس صورت میں تو وہ اس جھوٹے اطمینان میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ وہ علاج کر رہا ہے حالانکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ علاج نہیں ہے -

ہم اس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہیں، کہ اس وقت مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے ہم اہل ہیں، حقیقتاً یہ کام اتنا مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اس کے لیے ایک دو یا چند اشخاص کی فکر کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی - اس کام کے لیے پوری ملت کے اربابِ فکر کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے اور اسی وقت اس کا کوئی مستقل حل یا علاج سوچا جا سکتا ہے لیکن مذکورہ بالا حالات کو سامنے رکھتے ہوئے طبیعت اس پر راضی نہیں ہوتی کہ جب تک یہ کام نہیں ہوتا ہے اس وقت تک ہم بالکلیہ خاموش رہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہی مجبور کر رہا ہے کہ ہم اس ضمن میں جو کچھ سوچ رہے ہیں اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں محض اس لیے دریغ نہ کریں کہ ہم سے زیادہ اہل لوگ اس موقع پر خاموش ہیں اور خاص طور سے یہ احساس اس کے لیے اور زیادہ محرک بن رہا ہے کہ ہم جو کچھ پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک قرآن و حدیث سے اخذ کیا ہوا نسخہ ہے اس لیے اس کا پیش کرنے والا کوئی ہو وہ بہر حال لوگوں کے لیے ایک قابلِ اعتنا چیز ہے -

اسی احساس کے تحت تقریباً ایک سال پہلے میں نے ماہنامہ "زندگی" میں مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کا مقصود یہی تھا کہ ملک و ملت کے صحیح حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس ضمن میں جو مختلف حل لوگوں کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں ان کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک صحیح اور قابلِ اخذ ہیں۔ اور اس کے بعد یہ واضح کیا جائے کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے مسائل کا صحیح حل کیا ہے، لیکن ابھی اس سلسلے کے چند ہی مقالات شائع ہوئے تھے کہ ملک میں الیکشن کا چرچا شروع ہو گیا اور چوں کہ آئندہ الیکشن کو گوناگوں وجوہ سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے نتائج مسلمانوں کے حال و مستقبل پر بہت گہرا اثر ڈالنے والے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلے کو عارضی طور سے ملتوی کر کے پہلے الیکشن کے مسئلے کو لے لیا جائے جو بہرحال اس عمومی مسئلے کی ہی ایک کڑی ہے اور اس سے فارغ ہو کر اس اصل سلسلے کو شروع کیا جائے۔ اس خیال کے تحت میں نے الیکشن پر لکھنا شروع کیا چنانچہ اس وقت تک اس کے سلسلے میں متعدد نمبر شائع ہو چکے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ جن لوگوں نے اس سلسلے کو ملاحظہ فرمایا ہے وہ اس کو پسند کرتے اور اسے وقت کی ایک ضروری چیز سمجھتے ہیں چناں چہ متعدد رسائل نے اس کو اپنے صفحات میں نقل کیا ہے اور کثرت سے لوگوں نے ہمت افزائی کے خطوط لکھے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ خواہش بھی کی ہے کہ اس کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ انہی حضرات کی خواہش و مطالبہ کی تکمیل ہے۔

میری خواہش یہ تھی کہ اس سلسلۂ مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے سے پہلے میں اس پر کچھ اطمینان کے ساتھ نظرِ ثانی کر سکتا لیکن افسوس ہے کہ مصروفیتوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور خاص طور سے اس کے آخری ابواب جو خلاصۂ بحث کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تسوید و ترتیب کے لیے تو بہت ہی ناکافی وقت مل سکا ہے کیونکہ مصروفیتوں کے ساتھ الیکشن کے سر پر آجانے کی وجہ سے اس کو شائع کرنے کی جلدی بھی ہے، تاہم نظرِ ثانی میں کافی اصلاح و ترمیم اور اضافہ کر دیا گیا ہے اور بعد کا حصہ بھی جہاں تک ہمارے مدعا کا تعلق ہے اس کی وضاحت کے لیے غالباً بالکل کافی ہے، رہی اس کی تفصیل تو انشاء اللہ فرصت مل سکی تو آئندہ اس کی کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

آخر میں میں یہ گزارش کرنی چاہتا ہوں کہ اس سلسلۂ مقالات کا جو اصل مقصود تھا یعنی یہ کہ مختلف طریق ہائے عمل میں سے صحیح طریقِ عمل کھل کر سامنے آجائے اس کے لحاظ سے میرے لیے یہ ناگزیر تھا کہ ان طریقہائے عمل پر تنقیدی نگاہ ڈالوں اس لیے مجھے اس کتاب میں جابجا مختلف جماعتوں اور اداروں پر تھوڑی بہت نکتہ چینی بھی کرنی پڑی ہے، یہ کام میں نے مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ کیا ہے اس لیے اس کے لیے مجھے معذور سمجھا جائے اور اس سے کوئی غلط معنی نہ نکالے جائیں۔

ابو اللیث
رام پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آئندہ انتخاب کی اہمیت

جمہوری نظام حکومت میں انتخابات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوا کرتی ہے۔ طرز حکومت کی تبدیلیوں اور نظم ونسق اور عام حالات میں اچھے یا برے ہر طرح کے انقلابات کا دامن انتخابات ہی کے ساتھ بندھا ہوا رہتا ہے، اس لیے ہندوستان میں بھی جمہوریت کے ابتدائی تجربات کے وقت سے انتخابات کی اچھی خاصی اہمیت محسوس کی جاتی رہی ہے لیکن آزادی کے بعد انتخابات کی اس اہمیت میں اب بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ آئندہ انتخاب آئین جدید کے بموجب بالغ رائے دہندگی کے اصول پر منعقد ہونے والا ہے اور اس وقت ملک میں متعدد ایسی پارٹیاں موجود ہیں جو اپنے سامنے ملک کے آئندہ نظم حکومت کے بارے میں اپنا خاص اور ایک دوسرے سے مختلف نظام اور پروگرام رکھتی ہیں، اس لیے آئندہ انتخابات کا مسئلہ اس وقت بڑے معرکہ کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور لوگ اس وقت سب سے زیادہ اسی

مسئلہ کی طرف متوجہ ہیں۔ ہر پارٹی جو انتخاب میں حصہ لینا چاہتی ہے وہ ابھی سے اس کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ہر طرح کی تیاریاں مکمل کی جارہی ہیں تاکہ انتخابات میں زیادہ سے زیادہ کامیابیاں حاصل کی جاسکیں اور اس موقع کے ضائع ہوجانے کے بعد آئندہ پانچ سال تک انھیں زحمت کش انتظار نہ ہونا پڑے۔ جو جماعتیں حکومت و اقتدار سے اس وقت محروم ہیں ان کی سرگرمیاں خاص طور سے بہت تیز ہیں اور یہ بالکل قدرتی بات ہے کیونکہ انھیں ایک رائج و مقبول نظام حکومت کا مقابلہ کرنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی قائم شدہ نظم حکومت کو اکھاڑ پھینکنا کوئی آسان بات نہیں ہے، اور جو پارٹی برسر اقتدار ہے وہ بھی اپنی جگہ کچھ مطمئن سی ہے کہ اس کو شکست دیدینا کسی پارٹی کے لیے کوئی آسان بات نہیں ہے لیکن وہ بھی اپنی تیاریوں سے غافل نہیں ہے، اس نے بھی الیکشن جیتنے کے لیے ہر طرح کے انتظامات شروع کر دئے ہیں۔ کانگریس کے آئین پر نظر ثانی، کانگریس کی اندرونی اصلاح کے چرچے اور مختلف کمیٹیوں کا قیام یہ سب ابھی تیاری کی تمہید ہیں۔ بہر حال آزاد ہندوستان کے اس پہلے انتخاب کی پوری اہمیت یہاں کی ہر جماعت پوری طرح محسوس کر رہی ہے اور اسی کے مطابق اپنی پوری کوشش کے ساتھ اس انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سرگرم کار ہے۔

مسلمانوں کی غفلت

لیکن جہاں ایک طرف انتخابات کی یہ ہماہمی ہے اور اس کے لیے شدومد کے ساتھ یہ تیاریاں ہو رہی ہیں یہ بات ہمارے لیے انتہائی رنج و قلق کا موجب ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے یہ انتخابات جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے ہیں۔ ان کی مجلسیں بالعموم ان کے ذکر سے خالی ہیں یا اگر ان کا ذکر ہے تو محض اس حیثیت سے کہ ملک میں کوئی تماشا ہونے والا ہے جس میں ان کو اس حیثیت سے حصہ لینا ہے کہ اس سے وہ کچھ لطف و تفریح حاصل کر سکیں اور بس اس سے زیادہ ان کو اس سے کوئی غرض و مطلب نہیں ہے۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق مسلمانوں کی اکثریت ان ہی دو قسموں میں منقسم ہے اور ان کے علاوہ جو لوگ ہیں ان کو مسئلہ انتخاب سے بلاشبہ دلچسپی ہے لیکن ان کی دلچسپی محض اس حیثیت سے ہے کہ ان کو ہندوستان کی چند مخصوص پارٹیوں میں سے کسی ایک کو اپنی تائید و حمایت کے لیے منتخب کرنا ہے یا وہ پہلے ہی سے ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر چکے ہیں اور اب اس کو انتخاب میں کامیاب بنانے کے لیے میدانِ جہاد میں اُترنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ انتخابات ان کی قسمت پر بھی اثر انداز ہونے والے ہیں اور ان کا ان کی مخصوص ملی حیثیت پر بھی بہت گہرا اثر پڑنے والا ہے اس لیے انھیں اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے ان کا مطالعہ کرنا ہے اور اس کے مطابق کسی

عملی اقدام کی ضرورت ہے تو اس اہم تر سوال سے ان کا ذہن یکسر خالی ہے۔ کیا کسی قوم کی اجتماعی موت کا اس سے بڑا بھی کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس حالت کے نتائج کو ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے تو کیا اس سے بھی کوئی بڑا موقع حسرت و ماتم کا ہو سکتا ہے؟

غفلت کے مُہلک نتائج

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے اور بظاہر اُن کے بارے میں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان کا مستقل فیصلہ یہیں رہ کر زندگی گذارنے کا ہے کیونکہ اگر یہ بھاگنے والے لوگ ہوتے یا ان کے لیے بھاگنے کے مواقع اور سہولتیں ہوتیں تو وہ آج سے پہلے اس وقت بھاگ چکے ہوتے، جب یہاں کے خاص حالات کے تحت یہاں سے مسلمانوں کی عام بھگدڑ مچی ہوئی تھی لیکن اگر اُس وقت انھوں نے بھاگنے کا نام نہیں لیا تو بظاہر یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کی حد تک اپنی قسمت ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر چکے ہیں اور وہ اسی سرزمین میں زندہ رہ کر اسی کی خاک میں پیوست بھی ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ان کے اس فیصلے کے ساتھ ان کا یہ رویہ کہاں تک مطابقت رکھتا ہے کہ وہ یہاں کے عام حالات یہاں تک کہ انتخابات جیسے مسائل سے بھی بالکل بے تعلق ہو کر زندگی

گزاریں!

اس ضمن میں سب سے پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ قوموں کی زندگی کا دار و مدار عمل اور حرکت پر ہے اور جمود و تعطل موت کا پروانہ ہے۔ اس لیے مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا یہ رویہ ناگزیر طور پر بدلنا پڑے گا۔ ورنہ زمانہ ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو مردہ لاشوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ ان کو روندتا اور کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا اور یہ قوم موت کی سسکیوں میں مبتلا ہو کر وقت پر اپنا دم توڑ دے گی۔ لا سامح اللہ

دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی قوم معاملاتِ زندگی سے غیر متعلق ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس زمانہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ کسی ملک کے چھوٹے بڑے ہر انقلاب کا اثر اس کے گوشے گوشے پر پڑتا ہے اور چھوٹی بڑی ہر قوم اس سے متاثر ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں کے ہر پیش آنے والے انقلاب پر بہت گہری نظر رکھنی ہے اور اس کے مطابق ان کو اپنی تیاریاں کرنی ہیں ورنہ یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی کہ آپ میٹھی نیند سوتے رہیں اور کوئی خطرناک انقلاب دفعتاً یا اپنی دھیمی رفتار سے اس طرح آپ کے سروں پر آ کر کھڑا ہو جائے کہ اس کو دیکھ کر آپ کے ہوش و حواس جواب دے دیں اور آپ کے لیے اس سے کوئی جائے فرار باقی نہ رہ جائے یا جس چیز کو آپ تماشا سمجھ کر اس سے لطف و تفریح حاصل کر رہے ہوں اسی

آپ کے لیے کوئی ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو جو آپ کی رہی سہی حیثیت کو بھی ختم کر دے
اور خاص کر انتخابات کا معاملہ تو اس زمانہ میں طرح طرح کے انقلابات
کا پیش خیمہ ہوتا ہے، ملک کے عام حالات اسی کے تابع ہوتے ہیں، اسی
کے نتائج سے ملکی نظم و نسق کا ہر رشتہ وابستہ ہے اس لیے کوئی قوم
جو زندگی سے دست برداری کا فیصلہ نہ کر چکی ہو وہ اس کو اپنے لیے تماشا
نہیں بنا سکتی اور نہ اس سے بے تعلقی اور بے توجہی اختیار کر سکتی ہے۔
اور ہندوستان میں تو انتخاب کا معاملہ مسلمانوں کے لیے اور زیادہ اہمیت
رکھتا ہے کیوں کہ انتخابات میں حصہ لینے والی متعدد پارٹیاں ایسی ہیں،
جن کی انتخابی دلچسپی زیادہ تر مسلمانوں ہی کے پیش نظر ہے اور مسلمانوں کے
لیے کچھ خصوصی فیصلے، ان کے انتخابی نقطۂ نظر کا اہم جز ہیں، اور یہ بات
تو بلا استثناء ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کہی جا سکتی ہے
کہ وہ جن نظاموں کو اپنا کر میدانِ انتخاب میں اتر رہی ہیں یہ وہ نظامہائے
حیات ہیں جن کا ایک مسلم کے تصورِ حیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
اور ان میں سے کسی کی کامیابی کا بھی مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں
ہو سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے تو زندہ
رہیں لیکن ان کی ملی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

بے تعلقی علاج نہیں ہے

ہمیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ تقسیم کے بعد ملک کے حالات کچھ

لیے رہے ہیں کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں پر ایک خاص طرح کے اضمحلال اور پژمردگی کی کیفیت طاری ہوگئی ہے اور جیسا کہ قاعدہ ہے اس پژمردگی نے ان کو ایک خاص طرح کے چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کا حال بعینہ اُس بچّہ کا سا ہو گیا ہے جو والدین یا کسی اور کے کسی ناروا سلوک سے خفا ہو کر زمین پر بیٹھ رہتا ہے اور پھر سمجھانے والوں کی منت و سماجت پر بھی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا بلکہ اور زیادہ غصّہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ نوچنے لگتا ہے۔ ان کی اس کیفیت کا ہمیں اندازہ ہے اور ہم اس کو ایک حد تک حالات کا قدرتی نتیجہ بھی سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں جو قوم بھی مبتلا ہوگی اس کا کم و بیش اس طرح کی کیفیات میں مبتلا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے اور ہم اس پر مسلمانوں کو مستحق تعریف سمجھتے ہیں کہ ان حالات کا وہ کم سے کم اثر انھوں نے قبول کیا ہے جو دُنیا کی کوئی قوم قبول کر سکتی ہے لیکن اس کے باوجود مُسلمانوں کو اپنے غم و غصّہ کی کیفیتوں سے بالکل الگ ہو کر اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کے تحت جو رَویہ اس وقت اختیار کیے ہوئے ہیں وہ ان کی شکایات کے ازالہ کی تدبیر ہے یا وہ آئندہ ان میں اور زیادہ اضافہ کا باعث ثابت ہوگا۔ بچے اگر ضد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کے لیے معذور سمجھے جا سکتے ہیں اور شاید ان کا یہ ضد کا رویّہ بھی اس اعتماد پر مبنی ہوتا ہے کہ ان کے والدین

اور اعزہ ان کو زمین سے اٹھا کر سینے سے لگالیں گے، لیکن مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو منانے والا کوئی نہیں ہے، اس لیے ان کو ضد کی بجائے خود سوچ سمجھ کر ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے جس میں ان کا فائدہ ہو ورنہ ان کو بیٹھے چھوڑ کر آگے بڑھنے والے آگے بڑھ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آگے بڑھنے والے ان کو بیٹھے دیکھ کر اور دو چار ٹھوکریں رسید کر دیں۔ یہ دنیا بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے یہ کشمکش کا مقام ہے اس لیے مسلمانوں کو یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہونے والا ہے ہوتا رہے گا۔ ان کی علحدگی کی وجہ سے کوئی کام بند نہیں ہو جائے گا اس لیے انھیں جو کچھ کرنا ہے اسے کرنے کی فکر کرنی چاہیے ورنہ بعد کو پچھتانے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تو کیا مسلمان خدانخواستہ اپنے اسی طرح کے انجام کے لیے آمادہ ہیں؟

کام کے غلط نقشے

مسلمانوں کی اکثریت کا عام طرزِ عمل تو وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی جمود وخمود اور معاملات زندگی سے بے تعلقی لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو معاملات و مسائل میں حصہ لے رہے ہیں یا لینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اب تک اپنے کام کے جو نقشے تیار کیے ہیں وہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے انتہائی مہلک اور اسلامی نقطۂ نظر سے حد درجہ غلط ہیں۔

قومی تنظیم | کچھ لوگ اس انداز میں سوچ رہے ہیں اور ہیں اندیشہ ہے
کہ انتخابات کا زمانہ جتنا قریب آتا جائے گا اس انداز کے سوچنے
والوں کی تعداد بڑھتی جائے گی — کہ اس وقت سب سے مقدم
کام مسلمانوں کی قومی تنظیم ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اس وقت
مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانیاں پیش آرہی ہیں وہ قومی تنظیم کے
فقدان کا براہ راست نتیجہ ہیں اور آئندہ کے لیے اُن کو جو خطرات
درپیش ہیں ان کا مداوا اگر ممکن ہے تو اس کی واحد راہِ عمل قومی تنظیم ہے
گذشتہ دنوں یوپی کے بعض مقامات پر مسلمانوں کے بعض کنونشن
منعقد ہو چکے ہیں اور جہاں تک ہم نے اندازہ کیا ہے ان میں شریک
ہونے والوں کے ذہن و دماغ پر یہی احساس سب سے زیادہ چھایا
ہوا رہا اور ہمارا خیال یہ ہے کہ جو لوگ اس سے پہلے مسلمانوں کی
قومی تنظیم کی تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں ان کی اکثریت زیادہ تر اسی طرز عمل کی حامی
ہے لیکن ہم نے اس مسئلہ پر جہاں تک غور کیا ہے ہماری قطعی دیانتدارانہ رائے
یہ ہے کہ یہ طرز فکر خاص کر ہندوستان کے موجودہ حالات میں انتہائی غلط اور
حد درجہ تباہ کن ہے۔

بلاشبہ یہ پسندیدہ بات ہے کہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہوں۔
واقعہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بالکل بکھرا ہوا ہے، وہ انتہائی
پراگندگی کی زندگی گذار رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہندوستان میں چار
کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی بالکل بے وزن ہو کر رہ گئے ہیں اور

اس کے باعث وہ طرح طرح کے نقصانات اٹھا رہے ہیں جن سے بچنے کے لیے ان کا متحد ہونا ضروری ہے اور آئین کے بموجب ان کو ایسا کرنے کا پورا پورا حق بھی حاصل ہے؟ لیکن اس کے ساتھ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ اتحاد و تنظیم اگر محض قومیت کی بنیاد پر قائم ہوگی اور اس کا مقصد محض یہ ہوگا کہ ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں پر اس کا دباؤ ڈالا جائے اور ان سے اپنے قومی حقوق کے بارے میں کوئی سودا کیا جائے تو یہ اتحاد و تنظیم ان کے لیے دینی حیثیت سے بھی غلط ہوگی اور اس سے ان کو دنیوی اعتبار سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکے گا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی موجودہ انتشار کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ بات عملاً ممکن بھی ہے؟ ہندوستان کے موجودہ حالات بلاشبہ اُن کے اتحاد و تنظیم کے داعی و محرک ہیں چنانچہ اسی بنا پر اس وقت بہتوں کے دلوں میں اس کی خواہش انگڑائیاں لے رہی ہے لیکن دوسری طرف حالات ہی نے ان کے لیے اس اتحاد و تنظیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ مسلمانوں کا حال ایک عرصہ سے یہ ہو رہا ہے کہ ان کا دین کا رشتہ جو اُن کے درمیان حقیقی رابطہ اتحاد تھا بہت کمزور ہو گیا ہے۔ وہ حبل اللہ المتین کو چھوڑ کر مختلف احزاب میں تقسیم ہو گئے ہیں جن کا کسی ایک نقطۂ اتحاد پر جمع ہونا بہت دشوار کام ہے، پھر اسی کے ساتھ بلکہ اس کے نتیجہ میں ان میں مفاد پرستی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے جس کے باعث اسلام یا مسلمانوں کے حقیقی مفاد کی ان کی

نگاہوں میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ اگر وقتی جذبات کے تحت جمع بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے کبھی کبھی ہوا ہے تو وہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہوتی ہے، جمع ہوتے ہی وہ منتشر ہونا شروع کر دیتے ہیں اور وہ جمع ہونا بھی اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اس پر اس لفظ کا اطلاق صورت کے لحاظ سے تو شاید کسی درجے میں صحیح ہو سکے لیکن حقیقتاً وہ جمع ہونا بھی درحقیقت انتشار ہی کی ایک شکل ہوتی ہے کیونکہ وہ حقیقی روح جو جمعیت کا خاصہ ہے وہ کسی طرح پیدا نہیں ہو پاتی اور اسی بنا پر وہ نہ تا دیر قائم رہ سکتی ہے اور نہ کسی ناموافق حالت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

اور تقسیم کے بعد نوجوان کے انتشار کی یہ کیفیت اور زیادہ نمایاں ہو گئی ہے، ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یک جہتی موجود نہیں ہے۔ اور اس وقت ہندوستان کے مخصوص حالات بھی ایسے ہیں جو اس میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔ اور یہ پچھلے دور کے موانع کے ماسوا ہیں — مسلمانوں میں ابن الوقت اور مفاد پرست قسم کے لوگ پہلے بھی تھے لیکن اس وقت حالات ایسے مجبور کن نہیں تھے کہ وہ اسلام یا مسلمانوں سے ساتھ اپنے تعلق کو مصلحتاً بھی ظاہر نہ کر سکیں لیکن اب لوگوں کی مصلحت اندیشیاں ان کو اسی بات پر مجبور کر رہی ہیں چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے بہت بڑے لوگوں کا یہ شیوہ سا ہو گیا ہے کہ وہ علانیہ ان سے اپنی بے تعلقی کا مظاہرہ کریں اور کتنے لوگ تو ایسے ہیں جو محض اظہار بے تعلقی کو کافی نہ سمجھ کر ان چیزوں سے اپنا تعلق قائم کرتے جا رہے ہیں جن سے تعلق کے معنی ترک دین

کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کی اس حالتِ انتشار کا اندازہ آپ اور باتوں کے سوا صرف اتنی ہی بات سے بخوبی کر سکتے ہیں کہ آج ہندوستان کی کوئی پارٹی نہیں ہے جس میں مسلمان شریک نہ ہوں، حد یہ ہے کہ ہندو مہا سبھا کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق بہت سے مسلمان ہندو مہاسبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں جس کے مقاصد و عزائم مسلمانوں کے لیے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہیں۔ گویا مسلمانوں کی حیثیت اس وقت یہ ہو گئی ہے کہ نہ ان کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ کوئی مخصوص مطمحِ نظر، وہ ہر اس پارٹی کا ممبر بن سکتا ہے جس کی ممبری اس کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ اس کے خیال کے مطابق کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس آخر وہ کون سی تدبیر ہے جس کے ذریعہ آپ یہ توقع کر سکتے ہوں کہ مسلمان مستقلاً نہ سہی انتخاب کی عارضی مدت کے لیے، انتخاب کو اپنے مفید مقصد بنانے کے لیے مجتمع ہو سکیں گے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مسلمان اپنی اندرونی کمزوریوں اور بیرونی موانع کے باوجود متحد ہو سکتے ہیں تو بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جہاں تک الیکشن کا تعلق ہے اور جس پر غور کرنا اس وقت اصل مقصود ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ تنظیم مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہو سکتی ہے

قومی تنظیم اور الیکشن

انتخاب میں حصہ لینے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان بحیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیں اور اپنے طور سے اپنے اُمیدوار کھڑے کریں۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں مسلمان شاید ایک دو نشستیں بھی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ہندوستان کا آئندہ انتخاب جداگانہ طرز کی بجائے مخلوط بنیاد پر ہوگا جس میں کسی اُمیدوار کی کامیابی کے لیے ضروری طور پر غیر مسلموں کی تائید و حمایت کی ضرورت ہوگی کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی حلقۂ امیدواری ایسا ہوگا جس میں مسلمانوں کی اتنی اکثریت ہو کہ وہ تنہا اپنے ووٹوں کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کر سکیں انھیں لامحالہ غیر مسلموں کی تائید و حمایت کی ضرورت پیش آئے گی اور موجودہ حالات میں یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ان کے ووٹ اگر کسی مسلم اُمیدوار کو مل بھی سکتے ہیں تو وہ یقیناً وہ نہیں ہوگا جس کی تائید مسلمانوں کی تنظیم کر رہی ہو، یہ چیز عام غیر مسلموں کے نزدیک اس اُمیدوار کی نالائقی کی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔ اُن کا ووٹ اگر کسی مسلمان کو مل سکے گا تو وہ ایسا ہی مسلمان ہوگا جو مسلمانوں سے اپنا رشتہ ناتہ منقطع کر چکا ہو اور اس کے دلائل و شواہد بھی اپنے ساتھ رکھتا ہو اور ایسے امیدوار دُوں کا مل جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے ہم میں ایسے لوگوں کی کمی یوں بھی نہیں ہے اور اگر ہو تو ضرورت پڑنے پر اس کا انتظام بآسانی ممکن ہے اور ضرورت

بہر حال ہوگی کیوں کہ جب تک کچھ مسلمانوں کے نام ممبران کی فہرست میں شامل نہ ہوں گے، ہندوستان کے سیکولرزم کا روپ ناقص رہ جائے گا اس لیے ایسے اُمیدوار ہر قیمت پر فراہم کیے جائیں گے۔

دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان اپنے اُمیدوار علحدہ نہ کھڑے کریں بلکہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کرلیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کے لیے جدوجہد کریں۔

اگر یہ صورت ممکن العمل ہو تو مخلوط انتخاب کی حالت میں بلاشبہ یہ صورت مسلمانوں کے لیے بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس کا ممکن العمل ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس میں رکاوٹ تنہا یہی بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یا ان کی اکثریت کسی ایک پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ پر متفق نہیں ہو سکتی بلکہ خود ان پارٹیوں کی طرف سے اس کے لیے آمادگی ایک بڑی مشکل بات ہے۔ یہ پارٹیاں بلاشبہ اس وقت آپ کی حمایت و تائید کی بھوکی ہیں اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندو مہاسبھا تک نے بھی اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے کھول دیا ہے لیکن اگر آپ کو ان کی ذہنیت کا اندازہ ہو تو آپ بآسانی اسے محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے آپ کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں جو مسلم قوم کے لیے بحیثیت قوم کچھ سودمند ہو سکے، ان کی اولین کوشش تو یہ ہوگی کہ وہ گرہ سے کچھ خرچ کیے بغیر محض ڈرا دھمکا کر آپ کے ووٹ حاصل کرلیں لیکن اگر آپ جرأت سے کام لیں گے اور اُن

کی دھمکیوں میں نہیں آئیں گے تو پھر وہ آپ کو آپ کے ووٹوں کی زیادہ زیادہ جو قیمت دے سکتے ہیں وہ چند خوشامدانہ الفاظ ہوں گے یا مستقبل کے کچھ زبانی یا کاغذی وعدے جن کی اہمیت زیادہ سے زیادہ انتخاب کے زمانہ تک باقی رہے گی اور اس کے بعد وہ حوالۂ طاقِ نسیاں ہو جائیں گے

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ پارٹیاں آپ کے ساتھ.....
جو کچھ بھی سودا کرنا چاہیں گی وہ آپ کی قومی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ ہندوستان کی تمام پارٹیاں خواہ وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں ہی کیوں نہ ہوں اگرچہ باہم مختلف امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس ایک نقطہ پر وہ سب متفق ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاملہ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر نہ کیا جائے اور اس کے وجوہ بالکل ظاہر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہاں کی ہر پارٹی خواہ وہ اپنے کو کیسے ہی عالمگیر و ہمہ گیر اصولوں کی حامل کیوں نہ ٹھہراتی ہو، ایک قومی نظریہ کی اپنے مخصوص مفہوم کے ساتھ دل سے حامی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر کوئی معاملہ کرنا اس نظریہ کے سراسر منافی ہے، ان میں سب سے زیادہ وسیع ظرف رکھنے والے بھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی قومی وجود ہو اور وہ ان پر اس کا کوئی معمولی دباؤ بھی ڈال سکیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ایسا کرنا کھلے طور پر ایک ایسے اصولی کی بات ہے.. یہ پارٹیاں بہر حال اپنے سامنے کچھ نہ کچھ اصول و مقصد رکھتی ہیں جن کو وہ

حتی الوسع نباہنا چاہتی ہیں، نہ وہ اگر اپنے اصول اور مقصد کو چھوڑ سکتی ہیں تو اسی وقت جب اس سے کوئی بڑا فائدہ مقصود ہو مثلاً سننے میں آرہا ہے کہ بعض مشہور اصولی جماعتیں الیکشن جیتنے کی خاطر ایسی پارٹیوں کے ساتھ اتحادِ عمل کرنے پر آمادہ ہیں جن کے درمیان باہم کسی تیسری پارٹی کی مشترکہ دشمنی اور مخالفت کے سوا اور کوئی رشتۂ اتحاد نہیں ہے لیکن ظاہر ہے مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کی نوعیت یہ نہیں ہے اس سے جتنا فائدہ پہونچ سکتا ہے اس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے مسلمانوں کے ساتھ قومی بنیاد پر سمجھوتہ کرکے کوئی پارٹی الیکشن جیتنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی یہ سمجھوتہ بجائے خود اس پارٹی کی قومی غداری کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا اور یہ بات اسے الیکشن میں لے ڈوبے گی ایسی حالت میں عقلمندی کا تقاضا ہر پارٹی کے لیے یہی ہے کہ وہ اپنے اصولی ہونے پر سختی سے جمی رہے اور اس میں ذرہ برابر لچک پیدا نہ ہونے دے۔ الیکشن کا زمانہ کیسے ہی جنون کا زمانہ کیوں نہ ہو کوئی پارٹی الیکشن جیتنے کے شوق میں اتنی دیوانی نہیں ہوسکتی کہ وہ مسلمانوں کے تھوڑے سے ووٹوں کے لیے یہاں کی اکثریت کو اپنا مخالف اور دشمن بنالے لیکن اگر کوئی پارٹی ایسی نکل بھی آئے تو اس سے بھی بڑی دیوانگی کی بات یہ ہوگی کہ آپ کسی ایسی دیوانہ پارٹی کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کریں۔ اس صورت میں اگر مسلم قوم کا بیڑا خدانخواستہ کل ڈوبنے والا ہوگا تو آج ہی ڈوب جائے گا۔ تو کیا اس کے لیے آپ کا دل آمادہ ہے؟

قومی تنظیم سے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کی تیسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان متحد ہونے کے بعد اگر بحیثیت قوم کسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ کر سکیں تو کسی منظم طریق کے مطابق وہ الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں اور اس پارٹی کو کامیاب بنانے میں حصہ لے کر اس کی فتوحات میں ساجھی بنیں

یہ صورت دیکھنے میں بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس کی گہرائیوں میں اتر کر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اول تو یہ صورت بھی ناقابل عمل ہے اور دوسرے اس سے مسلمانوں کو بحیثیت قوم کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ ناممکن العمل اس لیے کہ ایک طرف مسلمان افراتفری کے شکار ہیں، نہ وہ متحد ہو سکتے ہیں اور نہ ان میں بحالات موجودہ اس کی صلاحیت ہی ہے کہ وہ منظم طور پر اس تدبیر کو زیر عمل لائیں اور دوسری طرف یہ کام بھی چونکہ مسلم قوم کی قومی تنظیم ہی کا ایک شاخسانہ ہوگا اس لیے اس کے ساتھ ان پارٹیوں کا طرز عمل وہی ہوگا جو اس سے پہلے اجتماعی سمجھوتہ اور نجاوں کے ضمن میں گذر چکا ہے، اس لیے اس کا نتیجہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہو سکتا۔

اور غیر مفید اس لیے کہ ان دونوں باتوں کی موجودگی میں اس تدبیر کی جو عملی شکل ہوگی وہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ان پارٹیوں میں مسلمان محض اپنی انفرادی حیثیت میں شریک ہوں اور وہاں پہنچ کر اپنے طور پر اسلام یا مسلمانوں کی کوئی خدمت بجا لائیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان کی یہ انفرادی شرکت مسلمانوں کے عمومی فائدے کے لحاظ سے بالکل ہی بے سود ثابت ہوگی جس کے وجوہ کھلے ہوئے ہیں۔

کسی پارٹی میں کسی مسلمان کی شرکت خواہ وہ عارضی طور سے انتخاب ہی کی خاطر کیوں نہ ہو کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے کہ آپ نے اس کا ارادہ کیا اور یہ پورا ہو گیا اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے امتحان و آزمائش کی ایک کڑی منزل سے گذرنا ہوگا۔ یہ اللہ کا دین تو ہے نہیں جس میں شرکت بہت آسان ہو گئی ہے، یہ پارٹیوں کا معاملہ ہے جو دکھاوے ہی کے لیے سہی بہر حال اپنے سامنے کچھ اصول و مقصد رکھتی ہیں اور جب تک ان کو کسی کے بارے میں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ دل سے ان کے اصول اور مقاصد کا ماننے والا ہے آسانی کے ساتھ اپنا دروازہ اس کے لیے کھول نہیں سکتیں اور خاص کر ایک مسلمان کے حق میں تو وہ اس احتیاط کی بہت زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں کیونکہ مسلمانوں کے بارے میں ان کو جو کچھ واقفیت ہے اس کے لحاظ سے وہ ان کے بارے میں پہلے ہی سے یہ بدگمانی یا خوش گمانی رکھتی ہیں کہ وہ ان کے اصولوں سے زیادہ اسلام کے اصولوں کا پابند ہوگا بہر حال کافی چھان بین اور آزمائش کے بعد وہ کسی مسلمان کو اپنے اندر گھسنے کی اجازت دے سکتی ہیں اور اس کے بعد بھی وہ آخر دن تک اس سے مطمئن نہیں ہو سکتی ہیں اس لئے تحقیقات اور آزمائشوں کا سلسلہ داخلہ کے بعد بھی ختم نہیں ہو جائے گا، نئے نئے سوالات اور مواقع، خلوص و وفاداری کی جانچ کیلئے برابر سامنے آتے رہیں گے۔

پھر داخلہ کے بعد ہر مسلمان ممبر کو پارٹی ڈسپلن کا پورا پورا پابند ہونا پڑے گا کوئی ممبر پارٹی کے فیصلوں سے سر مو انحراف نہیں کر سکتا ورنہ اس کی کم از کم

سزا اخراج ہے۔ گویا کسی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد آپ کی پوری حیثیت پارٹی میں ضم ہو جائے گی، یہاں تک کہ آپ اپنے زبان و دل کے بھی مالک نہیں رہیں گے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ انفرادی حیثیت میں کسی پارٹی میں شریک ہو کر اسلام یا مسلمانوں کے فائدے کے لیے کیا کام کر سکتے ہیں، الا یہ کہ آپ اپنے اندر اتنی قوت رکھتے ہوں کہ آپ اس پارٹی کو بنیادی طور سے بدل ڈالیں لیکن کوئی احمق ہی ہو گا جو موجودہ حالات میں اس کے امکان کا تصور بھی کر سکے یہ تو خیر دور کی بات ہے آپ کو اکثر حالات میں تو شاید یہ دیکھنا پڑے گا، جیسا کہ اس وقت عملاً دیکھا جا رہا ہے۔ کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر آپ اپنے دوستوں کی نگاہوں میں کچھ کھٹک تو نہیں رہے ہیں اور پھر اگر آپ کو اس پارٹی میں رہنا ہے تو اس طرح کے اشتباہ کو رفع کرنے کیلئے آپ کو ایسی حرکتیں کرنی پڑیں گی جو اسلام یا مسلمانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوں۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ جب اپنی وفاداری کا پورا پورا امتحان دے چکیں اور اس میں سو فیصدی کامیاب ہو جائیں تو آپ اس پارٹی کی طرف سے الیکشن میں امیدوار بنا کر کھڑے کر دئے جائیں بلکہ اگر آپ کا نصیب زور آور ہو گا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الیکشن میں اس پارٹی کے کامیاب ہو جانے پر آپ کو کوئی عہدہ و منصب بھی حاصل ہو جائے لیکن یہ یاد رکھیے کہ یہ سب عنایتیں آپ کے "لائق" ہونے کی بنیاد پر ہوں گی۔ نہ کہ اس بنیاد پر کہ آپ مسلمان ہیں اور ان عنایتوں سے آپ شخصی طور سے متمتع ہو سکیں گے اس سے آپ اسلام یا مسلمانوں کو کوئی

فائدہ نہیں پہونچا سکیں گے۔

مذکورہ بالا باتوں کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی قومی تنظیم واقعات و تجربات کی روشنی میں کتنی غلط اور بے نتیجہ ہے اور اس سے ان کو نہ دین کا کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے اور نہ دنیا کا لیکن اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ ایک اور اہم بات کی طرف بھی مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان باتوں سے قطع نظر کہ بحالات موجودہ قومی تنظیم کی نازک بیل کا منڈھے چڑھنا ممکن بھی ہے یا نہیں اور اس کے ذریعہ ہم الیکشن میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں، ہمارے لیے سب سے زیادہ قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ قومی تنظیم کے جو تلخ تجربات ہم نے اٹھائے ہیں جن کا ایک شاخسانہ ہماری موجودہ مشکلات و مصائب بھی ہیں، ان کے بعد اب دوبارہ اس کا تجربہ کرنا ہمارے لیے کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہندوستان میں جو ہندو مسلم کشمکش پیدا ہو گئی ہے اور جس میں خود ہماری غلط کاریوں کا بھی کافی دخل ہے اس کا ختم ہونا اسلام کے لیے بھی مفید ہے کیونکہ اس کشمکش نے غیر مسلموں کے دل و دماغ کا دروازہ اسلام کے لیے بند کر دیا ہے اور یہ مسلمانوں کے دنیاوی فائدوں کے اعتبار سے بھی ضروری ہے کیونکہ قومی بنیادوں پر مسلمانوں کی تنظیم اور قومی حقوق کے لیے ان کی کشمکش کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی میں اور زیادہ اضافہ ہو اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں جہاں تقسیم کے بعد مسلمانوں

کی حیثیت ایک قابل رحم قلیت کی ہو گئی ہے یہ کشیدگی ان کے لیے مستقل نقصانات و خطرات کا موجب ہو گی نہ کہ کسی خیر و فلاح کی۔

اور ایک اس سے بھی اہم بات اور ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے بھی عرض کر دوں کہ قومی تنظیم کے مسئلہ پر غور کرتے وقت کبھی آپ نے اس سوال پر بھی غور کیا ہے کہ دنیا میں آپ کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا محض یہ کہ آپ بھی دنیا کی اور قوموں کی طرح کی ایک قوم ہیں اس لیے انہی کی طرح بالکل قومی بنیادوں پر آپ کو اپنی تنظیم کی فکر کرنی چاہیے یا یہ ہے کہ آپ ایک اصولی جماعت ہیں جو دنیا میں خدا کا آخری پیغام اپنے قول و عمل کے ذریعہ پیش کرنے کے لیے مبعوث کی گئی ہے اگر فی الواقع آپ کا خیال یہی ہے کہ آپ ایک قوم ہیں تو ضرور اپنی تنظیم انہی اصولوں پر کیجیے جو اور قوموں کے سامنے ہیں اور اس راہ کی کسی مشکل یا خطرہ کی کوئی پروا نہ کیجیے لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ آپ اپنے کو قوم کی بجائے حزب اللہ سمجھتے ہیں تو ضروری طور پر آپ کو اپنا زاویۂ نظر اور طریق کار سب کچھ بدلنا پڑے گا اور اس تبدیلی کے بعد قومی تنظیم کے بارے میں آپ کا موجودہ نقطۂ نظر خود بخود بدل جائے گا۔

سیاسی پارٹیوں میں شرکت

مسلمانوں میں سوچنے اور کام کرنے والوں کا ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو قومی تنظیم کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کا تو حامی ہے وہ اس کو ناممکن بھی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن بھی لیکن اسی کے ساتھ

وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے اور خاص طور سے انتخابات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ملک کی کسی نہ کسی پارٹی میں ضرور شریک ہو جانا چاہیے چنانچہ انھوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق ان جماعتوں میں سے کسی نہ کسی کو اپنے لیے منتخب بھی کر لیا ہے اور اب ان کی کوششیں انہی کی تائید و حمایت کے لیے وقف ہیں۔ ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ جب ہم ملکی سیاست سے الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے اور نہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے تحت اپنی کوئی جداگانہ تنظیم قائم کر سکتے ہیں تو اس کے سوا ہمارے لیے چارۂ کار ہی کیا ہے کہ ہم جس پارٹی کی شرکت کو اپنے لیے زیادہ مفید خیال کریں اس میں شریک ہو جائیں۔ اس طرزِ فکر کے حامیوں میں ایک طبقہ تو اُن مسلمانوں کا ہے جس کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یا تو پہلے ہی سے بہت کمزور ہو چکا تھا اور وہ محض ظاہر داری کے طور پر، یا جراُت کی کمی کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے اپنے تعلق کو نباہ رہا تھا یا تقسیم کے بعد یہاں کے حالات نے اس کو ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو چکا ہے اس لیے وہ بغیر کسی ذہنی خلش کے ان پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کا حامی و ہمنوا بن گیا ہے اور ذاتی طور سے وہ اس کو مفید سمجھتے ہوئے اس پر مطمئن ہے رہا اسلام یا مسلمانوں کا فائدہ تو گو اس کو اس سے کچھ مطلب و سروکار نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ اپنے ظاہری تعلق کو نباہنے کے لیے وہ کبھی کبھی اس پہلو سے بھی اس شرکت کے فوائد پر وعظ کہہ دیا کرتا ہے۔

اس طرح کے لوگ ظاہر ہے اس وقت ہمارے مخاطب نہیں ہیں، جن کو فی الواقع نہ اسلام کے فائدہ ونقصان سے کوئی بحث ہو اور نہ مسلمانوں کے فائدہ ونقصان سے ان کے سامنے زیادہ تر اپنی ذاتی عزت وسربلندی ہو اور بس، ایسے لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ہندوستان میں، اسلام یا مسلمانوں کو کیا مشکلات درپیش ہیں اور ان کے حل کی صحیح تدبیر کیا ہو سکتی ہے، اس لیے اس موقع پر ایسے لوگوں سے تعرض کرنا ایک بالکل غیر ضروری بات ہے۔

لیکن یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے زمرہ میں ہمیں ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن کے سروں پر علم وفضل کی دستاریں بندھی ہوئی ہیں اور ان کی زبانیں قال اللہ وقال الرسول کی نغمہ سنج ہیں اور فی الواقع ان کو اسلام اور مسلمانوں سے نہایت گہرا تعلق بھی ہے ایسی محترم ہستیاں، جن کا احترام ہمارے دل کے رگ وریشہ میں سمایا ہوا ہے جب کوئی ایسی روش اختیار کریں جو ہمارے نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو تو ان پر تنقید کرنا ظاہر ہے کہ ہمارے لیے کتنا مشکل کام ہوگا لیکن ہم سمجھتے ہیں یہ ہماری سخت دینی بددیانتی ہوگی اگر ہم ان ہستیوں کے احترام کی وجہ سے ان کے اس رویہ کے بارے میں جسے ہم پوری دیانت کے ساتھ غلط سمجھتے ہیں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار نہ کریں اس لیے ان کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم چند جملے ان کی اس روش کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان حضرات کا یہ رویہ خواہ کتنے ہی خلوص و دیانت پر کیوں نہ مبنی ہو، دینی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے غلط اور مسلمانوں کے

لیے انتہائی مہلک ہے۔

جہاں تک اس مسئلہ کے دینی پہلو کا تعلق ہے اس وقت اس پر کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اور نہ اہل علم کے تخاطب میں اس کی کوئی خاص ضرورت ہی ہے وہ خود بادنیٰ توجہ اس کو معلوم کر لے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان حضرات نے آج سے بہت پہلے، آج سے بالکل مختلف حالات میں، اپنے لیے جو راستہ پسند کیا تھا اس پر اب تک آنکھیں بند کئے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور اس پر دوبارہ نظرِ ثانی کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے یا اگر گستاخی نہ ہو تو ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کو اس پر کبھی کوئی بے اطمینانی محسوس بھی ہوتی ہے تو اپنی قدیم راہ کا طلسم ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے یا ضعف ہمت قدم روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور حقیقتاً یہ ذرا مشکل بات بھی ہے آدمی زندگی بھر جو کام اس اعلان کے ساتھ ساتھ کرتا رہا ہو کہ کرنے کا حقیقی کام یہی ہے وہ بڑی آسانی کے ساتھ اسے ترک کر کے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کر سکتا اور نہ نئے راستہ کے اختیار کرنے کی جو دشواریاں ہیں ان کے مقابلہ کی وہ ہمت کر سکتا ہے بہر حال ہمیں اس سے کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے کہ ان حضرات کے اپنی روشِ قدیم پر بدستور قائم رہنے کے حقیقی اسباب کیا ہیں اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے البتہ اصولی طور سے ہم اپنے علم کے مطابق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ روش نہ دین کی حقیقی مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق ہے اور نہ ان کے رتبہ اور ذمہ داریوں ہی کے شایانِ شان ہے اور یہ بات کسی لمبی چوڑی گفتگو کی بجائے صرف اس مختصر بات سے واضح ہو سکتی

ہے کہ ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں کہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو چند عقائد و رسوم تک محدود ہو بلکہ وہ ایک مستقل نظامِ حیات ہے جس کے دائرہ میں تمام انسانی امور و معاملات داخل ہیں اور ہر وہ شخص جو اسلام کا نام لیوا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ پوری طرح اس نظامِ حیات اور طریقِ زندگی کو عملاً اپنانے اور اس کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے جد وجہد کرے۔

اس لیے ایک مسلمان کی حیثیت نہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کو کوئی قوم سمجھ کر دنیا کی قوموں کی طرح قومی بنیادوں پر اپنے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرے اور نہ یہ ہے کہ وہ چند رسوم وعادات ادا کر کے اپنے دوسرے معاملاتِ زندگی کو اپنے طور سے یا کسی رائج الوقت نظریۂ حیات کے تحت چلانے کے لیے اپنے کو آزاد سمجھ لے۔

اس بنیادی بات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ خود غور کریں کہ آپ کے مسلم ہونے کی یہ حیثیت آپ سے کیا تقاضا کرتی ہے اور یہ روش اس حیثیت کے کہاں تک مطابق ہے کہ آپ دین کے چند احکام پر عمل کر کے اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ آپ اسلام کا حق ادا کر رہے ہیں اور اپنے بقیہ امور و معاملات کو نظر انداز کر کے ان پارٹیوں میں شریک ہو جائیں جن کا نظریۂ حیات آپ کے نظریۂ حیات سے قطعاً مختلف ہے بلکہ اس کی کامل نفی پر مبنی ہے۔

ملک کی موجودہ پارٹیاں

اس وقت موقع نہیں ہے کہ ہم ملک کی موجودہ پارٹیوں کے اصول و مقاصد پر

کوئی مفصل تبصرہ کریں لیکن چند جملے ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں تاکہ آپ ان سے اندازہ کر سکیں کہ ان کی شرکت کہاں تک ایک مسلم کی صحیح حیثیت کے مطابق ہو سکتی ہے۔

سوشلسٹ پارٹی آج ہمارے بہت سے علماء کا بھی مرکز امید ہے، لیکن کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ سوشلزم اپنی بنیاد اور اصول میں اسلام سے قدم قدم پر متصادم ہے۔ اسلام اس کائنات کے لیے ایک خالق کو مان کر اور اس کو انسان کا حقیقی مالک تسلیم کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے اور سوشلزم اس دنیا کو بخت واتفاق کا نتیجہ سمجھتا اور انسان کو اس میں حقیقی فرمانروا کا درجہ عطا کرتا ہے۔ ایک کا مقتدا محمد العربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور دوسرا لینن اور اسٹالن کا پجاری ہے۔ ایک کے لیے صحیفۂ ہدایت قرآن ہے اور دوسرا کیپٹل سے ہدایت و روشنی حاصل کرتا ہے ایک کا قبلہ کعبہ ہے اور دوسرا اپنا سر عجز و نیاز ماسکو کی طرف جھکاتا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

اور اسی پر کمیونسٹ پارٹی کو بھی قیاس کر لیجیے جو ان مخصوص معاملات میں اس سے بھی چند قدم آگے ہے،

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

یہی معاملہ کانگرس کا بھی ہے اس کے لادینی جمہوریت کے اعلان کی وجہ سے بہت سے مسلمان اسے دیگر جماعتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر اور اپنے دین و مذہب کے لیے بالکل بے ضرر سمجھتے ہیں لیکن ان کا ایسا سمجھنا

سادہ لوحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اول تو یہ لادینیت کا تصور خود کانگریس کے دائرۂ عمل میں کاغذی اعلان سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا جیسا کہ اس کے اس وقت تک کے کارنامے شاہد ہیں اور دوسرے لادینیت خود ایک دین ہے جس کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان خدائی دین سے بے نیاز ہو کر جمہور کی خدائی کے آگے جھک جائے۔

قابلِ ذکر جماعتوں میں ایک بڑی جماعت ہندو مہا سبھا بھی ہے جس نے انتخاب کے موقع پر نہایت فیاضی کے ساتھ اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے بھی کھول دیا ہے لیکن اس کے ضمن میں ہم کسی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہندو مہا سبھا کے عزائم اور عملی سرگرمیوں سے ہر مسلمان آگاہ ہے اس لیے اس کے بارے میں بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں شرکت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں ــــ خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی۔ ہندو مہا سبھا کے نیتوں کا اندازہ صرف اتنی بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو پارلیمنٹری سرگرمیوں میں تو شرکت کی آزادی عطا فرمائی ہے لیکن اس کے ماسوا دوسرے کسی اور دائرہ میں ان کے قدم کو آنے دینا نہیں چاہتی گویا ہندو مہا سبھا مسلمانوں سے اس بات کی تو ضرور خواہشمند ہے کہ وہ آئندہ الیکشن میں اسے کامیاب ہونے میں مدد دیں لیکن وہ ان مفاسد و عزائم میں کسی طرح کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے جو مسلمانوں کو پامال کرنے کے لیے اس نے پہلے سے تیار کئے ہیں، بالفاظِ دیگر اس کی خواہش یہ ہے کہ الیکشن کا لالچ دے کر مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا جائے تاکہ انہی کے حربوں سے ان کا صفایا کیا جا سکے،

کیا ستم ظریفی کی اس سے بھی نادر کوئی مثال ہو سکتی ہے ؟

ہمیں یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے کہ ہندو مہا سبھا جو نعرے لگاتی ہے ان میں سے بہت سے نعرے ایسے بھی ہیں جن کی واقعی ہمیں قدر کرنی چاہئے مثلاً وہ سیکولرزم کی مخالف ہے اور اس کی بجائے وہ سیاست میں مذہب و اخلاق کے اقدار شامل کرنے کی حامی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ یہ نعرے، جہاں تک ہمارا اندازہ ہے محض سیاسی چال کے طور پر عوام کو دھوکا دینے اور ان کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کے لیے لگا رہی ہے اور واقعی اس کے دل میں ان اقدار کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ مذہب کے حقیقی تصور ہی سے اب تک نا آشنا ہے۔ ہمارے نزدیک دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہو سکتا جس میں اس جارحانہ قوم پرستی کی گنجائش نکل سکے جس میں ہندو مہا سبھا مبتلا ہے لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ایک طرف وہ مذہب و اخلاق کے بلند بانگ دعوے بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اس پر قوم پرستی کی یہ لعنت بھی مسلط ہے۔

ان مذکورہ بالا جماعتوں کے بعد کوئی اور بڑی جماعت ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کی طرف مسلمان امید کی نگاہ اٹھا سکیں، رہیں نئی جماعتیں جو اس وقت انتخاب کے قرب کی وجہ سے برساتی کیڑوں کی طرح ہر روز پیدا ہو رہی ہیں تو ان کے متعلق ہم کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان جماعتوں کے بانی اور ان میں شریک ہونے والوں میں بہت سے لوگ بہت مخلص ہوں لیکن ان جماعتوں کے بارے میں یہ بات ضروری طور پر

قابلِ لحاظ ہے کہ یہ لوگ مذکورہ صدر جماعتوں ہی کے نظامِ شمسی کے ٹوٹے ہوئے تارے ہیں اس لیے یہ جماعتیں اپنے بنیادی خیالات وتصورات کے لحاظ سے اُن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوسکتیں اور اس لیے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ان کی حیثیت بھی وہی ہوسکتی ہے جو مذکورہ جماعتوں کی ہے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر غور کرنا چاہیے کہ دینِ اسلام کے پیرو جن کی حیثیت خود ایک نظام کے داعی کی ہے، کیا ان کو یہ بات زیب دے سکتی ہے کہ وہ اپنے دین کی پیروی اور اس کی دعوت کا کام چھوڑ کر کسی دوسرے دین کے داعی و مبلّغ بن جائیں؟ اگر وہ اپنے ضعفِ ہمت یا حالات کی وقتی ناسازگاریوں کی بنا پر اپنے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے اپنے کو عاجز و درماندہ پاتے ہیں، تو وہ شوق سے اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں لیکن کیا اس کے لیے بھی وہ کوئی عذر پیش کرسکتے ہیں کہ دینِ حق کی بجائے وہ اس کے مخالف کسی دین کی گاڑی کے قلی بن جائیں اور اس کو کھینچنے میں اپنی محنت و مشقت صرف کریں؟ ہمارے نزدیک تو ایسا کرنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ مسلمان کچھ نہ کریں اور خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں ہر چند یہ بھی جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، گوناگوں وجوہ سے مسلمانوں کے لیے انتہائی تباہ کن اور غلط ہے لیکن اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ وہ براہِ راست کسی غیر اسلامی حرکت و فعل کے ملزم نہیں بنیں گے، یہ بھی ایمان ہی کی ایک راہ ہے۔ گو ادنیٰ درجہ ضعف ایمان کی۔ کہ آدمی حق کے لیے کام نہ کرسکے تو کم از کم باطل کا ساتھ نہ دے تو کیا مسلمانوں میں اب اس ادنیٰ و ضعف ایمان کو برقرار رکھنے کی بھی سکت نہیں رہی ہے؟

ملک کی موجودہ پارٹیوں میں شرکت کا یہ دینی نقصان ہے جس کی طرف سرسری طور سے اشارہ کیا گیا ہے لیکن اگر آپ دنیاوی فائدہ ونقصان کے پہلو سے غور کریں گے تو اس پہلو سے بھی اس میں آپ کو اس کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آئے گا کہ آپ کے کچھ لوگ اسمبلیوں میں پہونچ جائیں یا وزارتوں کی گدی سنبھال لیں، لیکن یہ فائدے افراد کے لیے ہوں گے امت مسلمہ کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ یہ بات اس تفصیل سے بھی واضح ہو سکتی ہے جو ہم نے اوپر قومی تنظیم اور ایجیٹیشن کے ضمن میں پیش کی ہے اور اس وقت کے حالات بھی اس کا بیّن ثبوت ہیں اور اس پر مزید بحث انشاء اللہ آگے آئے گی۔

بہر حال اس وقت مسلمانوں کے سوچنے اور کام کرنے کے یہی دو نقشے ہیں۔ جن کے سلسلہ میں ہم نے اپنا نقطۂ نظر کسی قدر تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا ہے۔ آپ بھی اس پر غور فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ کیا واقعی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بس یہی دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جو دونوں کی دونوں ہلاکت و بربادی کی راہیں ہیں یا ان کے علاوہ ان کے لیے کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے جس کو اختیار کر کے وہ دین و دنیا دونوں کے نقصانات سے بچ سکیں اور ساتھ ہی وہ اس ملک کی بھی خدمت بجا لاسکیں جس میں وہ رہتے ہیں اور جس میں رہنے کی وجہ سے ان پر اس کی خدمت کی بھی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مسلمان کیا کریں؟

پچھلی بحث کے آخر میں جو سوال درج کیا گیا ہے اس کا جواب بظاہر بہت

مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ بحالات موجودہ مسلمانوں کا عام خیال یہی ہے کہ ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو سب کچھ چھوڑ کر خاموش بیٹھ رہیں اور انقلابات زمانہ کا تماشا دیکھیں یا اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی جداگانہ تنظیم قائم کریں یا موجودہ پارٹیوں ہی میں سے کسی پارٹی کا ساتھ دیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا سمجھنا محض کوتاہ اندیشی ہے۔ ان دونوں رستوں کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے اور وہی مسلمانوں کے لیے حقیقی نجات و سعادت کا رستہ ہے اور وہ اس وقت ان کو نظر نہیں آرہا ہے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے حالات ہی ایک عرصہ سے ایسے رہے ہیں کہ ان میں ان دونوں رستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نظر ہی نہ آسکے خواہ وہ اپنی جگہ کتنا ہی واضح اور روشن کیوں نہ ہو۔

آیئے آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس کوتاہ نظری کے اسباب کا بھی کچھ جائزہ لے لیں کیونکہ اس کے بغیر ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اسلام کی حقیقت اور مسلمانوں کا عمومی حال

اسلام دنیا کا وہ مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے کو بالکل خدا کے حوالہ کر دیں بلکہ لفظ اسلام کے لغوی معنی بھی کامل حوالگی ہی کے ہیں، اور یہی اس کا شرعی مدلول بھی ہے۔

پھر اسلام وہ مذہب ہے جس نے وضو اور طہارت سے لے کر سیاست و حکومت اور بین الاقوامی معاملات و تعلقات تک غرض جملہ امور و معاملات زندگی کے بارے میں نہایت واضح ہدایات دی ہیں اور یہ احکام محض

آخری مذہب ہونے کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل کر دی، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور ایک دین کے پسند کر لیا۔

اور یہ ہدایات دے کر وہ اپنے ماننے والوں کو اس بات کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس مجموعۂ ہدایات سے کچھ چیزیں از قسم عبادات وغیرہ الگ کر لیں اور ان کو ادا کر لینے کے بعد اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ انھوں نے اس کے ماننے کا حق ادا کر دیا بلکہ وہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی جملہ ہدایات کو نہ صرف خود پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں بلکہ ان کو دوسروں تک پہونچانے کی بھی پوری سعی کریں کہ اس کے بغیر مومن ہونے کا تقاضا پورا نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اسلام کی اس حقیقت کو زبانی طور سے تو ایک حد تک تسلیم کرتے رہے لیکن عملاً اس کو قائم کرنے کی انھوں نے کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ مجموعۂ دین کے کچھ اجزا جن کو انھوں نے نسبتاً آسان یا مفید پایا ان کو تو انھوں نے مضبوطی سے پکڑے رکھا لیکن دوسرے اجزاء کو جو دین میں کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ کچھ ایثار و قربانی اور مشقت کے بھی طالب ہیں ان کو وہ یکے بعد دیگرے چھوڑتے چلے گئے۔

مسلمان اس ملک میں زیادہ تر فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور جب تک

ان کی حکومت قائم رہی، حکمرانی کے افکار و مشاغل ہی ان کی توجہات کا بڑا مرکز بنے رہے اور ان کے انہماک نے انھیں اس بات کا بہت کم موقع دیا کہ وہ اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی خود اپنا ئیں اور دوسروں تک اس کے پیغام کو ٹھیک ٹھیک پہنچا دیں۔ تاریخ کے پچھلے ادوار میں بلاشبہ ہمیں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنھوں نے دین کی صحیح حیثیت کو خود اپنانے کی کوشش کی اور اس کو عملاً قائم کرنے کے لیے بھی انھوں نے جد و جہد کی لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں یہ کہنا بلا مبالغہ صحیح ہوگا کہ یہ چیز عمومی طور سے ان کے پیشِ نظر نہیں رہی ہے۔

اس غفلت و کوتاہی کا جہاں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مسلمانوں کی وہ اجتماعی قوت جو دین کی پیدا کردہ تھی وہ رفتہ رفتہ مضمحل ہوتی گئی ——— کیونکہ دین کو جزئی طور سے اپنانے سے وہ مسلمان تو باقی رہ سکتے تھے لیکن ان میں وہ باتیں پیدا نہیں ہو سکتی تھیں جو کل دین کو بحیثیت نظامِ زندگی اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، اور اس کی وجہ سے وہ طرح طرح کی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے جو بالآخر انقلابِ حکومت کا باعث بنا، اور دوسری طرف اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود دین کا تصور رفتہ رفتہ محدود سے محدود تر ہوتا چلا گیا۔

پھر چونکہ دین کے تمام اجزا باہم مربوط ہیں اور وہ اسی وقت تک اپنی اصلی شکل میں زندہ و قائم رہ سکتے ہیں جب تک کہ ان کا باہمی ارتباط قائم رہے اس لیے اس محدودیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جن باتوں کو باقی و برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ باتیں بھی اگر باقی رہیں تو اپنی بہت کچھ معنویت کھو کر۔

انقلابِ حکومت کے بعد

دین کو بحیثیت نظامِ زندگی اختیار نہ کرنے کے یہ دو زبردست نقصانات تھے جو مسلمانوں کو پیش آئے ——اجتماعی اوصاف و خصوصیات سے محرومی اور دین کے تصور کا محدود ہوتا چلا جانا ——چاہیئے تو یہ تھا کہ جب یہ باتیں کھل کر سامنے آ رہی تھیں تو ان کے تدارک کی بروقت کوشش کی جاتی لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کی قسمت میں ادبار لکھا جا چکا تھا۔ اس لئے یا تو اس کے لئے کوئی مؤثر کوشش عمل میں نہیں لائی گئی یا لائی گئی تو اس کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس وقت مسلمانوں میں اگر دینی حس بیدار رہی ہوتی تو انقلابِ حکومت کا واقعہ ان کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام دے سکتا تھا اور حقیقتاً عالم کے انقلابات اسی لیے ہوا کرتے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

(انسانوں کی اپنی کرتوتوں کی بدولت خشکی و تری میں فساد پھیل گیا تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا نتیجہ انھیں چکھائے تاکہ وہ (اپنی روش سے) باز آ جائیں۔)

لیکن چونکہ دین کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ پہلے ہی بہت کچھ مضمحل ہو چکا تھا اور عبرت اور اثر پذیری کے لیے تعلق باللہ کی جو کیفیتیں مطلوب ہیں ان سے مسلمانوں کا دل پہلے ہی بہت کچھ خالی ہو چکا تھا اس لیے اس انقلابِ عظیم کا بھی ان پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا تھوڑے دنوں تک ان پر کچھ حیرانی و سراسیمگی کی کیفیت تو ضرور طاری رہی کیونکہ یہ جو کچھ پیش آیا وہ عام لوگوں کے لیے ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال تھی اور ان میں جو نرم دل تھے انھوں نے اس پر حسرت و اندوہ کے آنسو بھی بہائے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد یہ کیفیت جاتی رہی اور پھر سب کچھ بھلا کر عام طور سے مسلمان اسی راستے پر چل پڑے جس کو محکوم قومیں ہمیشہ سے اختیار کرتی چلی آ رہی ہیں یعنی غالب قوم کی پیروی۔ اس چیز نے دین کے ساتھ ان کے لگاؤ کو اور زیادہ مضمحل و کمزور کر دیا۔ انگریز توپ و تفنگ

ہی کے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ وہ اپنے ساتھ جسموں سے زیادہ قلوب و اذہان کو مسخر کرنے والی چیز، ایک چمکتی ہوئی تہذیب بھی لے کر آتے تھے جو دیکھنے میں تو بڑی ہی خوشنما اور جاذب نظر تھی لیکن وہ اپنی روح و مزاج کے اعتبار سے اسلام اور اسلامی تہذیب کے لیے سم قاتل تھی کیونکہ اس کی بنیاد، خدا کے انکار یا اس سے بے نیازی پر قائم تھی اور اگر اس میں مذہب کے لیے کوئی گنجائش تھی تو محض اس حد تک کہ وہ انسان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک حقیر گوشہ ہے جس کو باقی رکھنا بھی چنداں ضروری نہیں ہے۔ یہ تہذیب چونکہ حکمراں قوم کی تہذیب تھی اور مسلمان اپنی ملّی خصوصیات سے پہلے ہی خالی ہو چکے تھے اس لیے ان کی اکثریت نے لپک کر اس کا خیر مقدم کیا اور اس بارے میں علماء، اور خاص طور سے بانیانِ دارالعلوم دیوبند کی مخالفتوں کی بھی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور پروا کر بھی کیسے سکتے تھے جبکہ اس وقت تک صدیوں کے اختلاط کے نتیجے میں ان کے دل دین اور علمبردارانِ دین کے حقیقی احترام سے خالی ہو چکے تھے اور اس کے مقابلہ میں دنیا ان کی نگاہوں میں مرغوب ہو چکی تھی جس کا حصول انگریزی تہذیب و تعلیم کے ساتھ نہایت حکمت عملی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی کچھ ہی دنوں بعد مسلمان اندر اور باہر دونوں حیثیتوں سے بدلنا شروع ہو گئے یہاں تک کہ بہت سے لوگ تو ظاہری طور سے انگریز بن گئے اور بہت سے اپنی ظاہری حیثیت میں تو مسلمان باقی رہے لیکن "لارڈ مکالے" کے بقول ان کا ذہن و دماغ بالکل انگریزی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھل گیا یہاں تک کہ جب ان کو اسلام یا مسلمانوں کے سلسلہ میں یہاں کی اکثریت کے طرز عمل سے خطرہ محسوس ہوا اور اس کو روکنے

کے لیے انھوں نے بند لگانا چاہا تو اس کے لیے اینٹیں اور گارا انھوں نے یورپ ہی کے کارخانوں کا تیار کیا ہوا فراہم کیا مسلم یونیورسٹی کا قیام اسی طرح کے مسلمانوں کے نیک ارادوں کا مظہر ہے — ہندوستان میں پچھلے دنوں قومی بنیاد پر جو تحریک اٹھی تھی اور جو بالآخر ہندوستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان پر منتہی ہوئی وہ اسی طرزِ فکر کا براہ راست نتیجہ تھی۔

یہ تو عام مسلمانوں کا حال ہوا لیکن اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ شروع شروع میں تو علماء دین نے اس تہذیب سے کافی ناک بھوں چڑھائی اور اس کو روکنے کے لیے کافی کوششیں بھی کیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ انگریزوں کا اقتدار روز بروز مستحکم ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور ان کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کا رخ اس اقتدار کی طرف ہے جس کے زیر سایہ یہ مادی تہذیب پھل پھول رہی تھی تو ان میں سے بہتوں نے تو ہوا کے رُخ پر چلنا شروع کر دیا اور وہ خود اس اقتدار کے دعاگو بن گئے اور اپنے لختہائے جگر کو اسی تہذیب کے آغوش میں پلنے کے لیے رضی خوشی حوالہ کر دیا، اور کچھ نے مایوس ہو کر گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا اور کچھ اگر مخالفت پر قائم بھی رہے تو یا تو ان کی مخالفت تمام تر انگریزوں کے اخراج کی سعی پر مرکوز رہی اور ان کی لائی ہوئی تہذیب کو روکنے کے لیے جو اب خود اپنے بل بوتے پر پھیلتی جا رہی تھی کوئی ٹھوس تدبیر اختیار نہیں کی بلکہ ایک حد تک خود اس کے ساتھ سازگاری کرنے لگے یہاں تک کہ انگریزوں اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں سے بچنے کے لیے سیاسی طریقے بھی وہی اختیار کیے گئے جو اسی تہذیب کے آوردہ تھے — یا کچھ لوگوں نے حالات کی ناموافقت سے دل شکستہ ہو کر صرف

اس بات پر اکتفا کر لیا کہ وہ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعہ کسی طرح اپنے کو اور اپنے زیر اثر مسلمانوں کو اس تہذیب و تمدن اور اس کے زہریلے اثرات سے بچائے جائیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تدبیر کسی نہ کسی درجے میں کامیاب ضرور رہی لیکن چونکہ یہ مدافعانہ طور پر اختیار کی گئی تھی اور اس کے ساتھ اس تہذیب کے اصل سرچشمہ کو بند کرنے کیلئے کوئی حقیقی موثر تدبیر عمل میں نہیں لائی گئی تھی اس لیے مرور ایام کے ساتھ قوت مدافعت بھی کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس تہذیب کے اثرات ان محفوظ گوشوں تک میں جا پہونچے جہاں دین ایک پناہ گزین کی حیثیت سے حفاظت کے ساتھ ٹھہرایا گیا تھا اور اس کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہونچی کہ خود ان حلقوں میں دین کی تفریق و تجزیہ کے رجحانات نشو و نما پانے لگے اور جو کارخانے اس لیے قائم کئے گئے تھے کہ وہاں سے دین کے علمبردار اور مبلغ اسلام تیار ہو کر نکلیں گے وہاں سے اس طرح کے لوگوں کی بجائے ایسے لوگ ڈھل کر نکلنے لگے جن کی جذبات پر اسلام کی بجائے قومیت و وطنیت کا رنگ غالب تھا اور اس طرح جن لوگوں کا طرز عمل دین کا صحیح نمونہ بن سکتا تھا خود ان کا نمونہ عام مسلمانوں کے لیے اس بات کی حجت بن گیا کہ دین و دنیا کی تفریق جائز ہے بلکہ بہت سے حالات میں ضروری بھی ہے -

تقسیم سے پہلے

غرض ہندوستان میں انگریزی اقتدار و تہذیب کے قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کا عام رخ اس کی خوشہ چینیوں ہی کی طرف منتقل ہو گیا یہاں تک کہ جو اس کے مخالف تھے وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی طرف جھک پڑے، اس دور کی اس خصوصیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے جو علماء گوشہ گیر نہیں ہوئے تھے بلکہ تگ و دو کے میدان میں سرگرم کار تھے

ان کا عام رجحان دین سے زیادہ سیاست کی طرف بڑھ گیا اور سیاست بھی وہ جس کو شش کر کے دین سے علیحدہ رکھا گیا تھا حتیٰ کہ اس دور میں اگر دین کی تبلیغ واشاعت کا کوئی کام بھی کیا جا رہا تھا تو اس کے پس پشت سب سے بڑا مقصد یا تو یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی عددی اکثریت بڑھائی جائے یا یہ کہ مسلمانوں کو باطل سیاست میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے جس دور میں دین کے بارے میں یہ معاملہ روا رکھا جا رہا تھا اس میں اس بات کی کہاں گنجائش نکل سکتی تھی کہ مسلمان اپنے دنیاوی مسائل کو خالص دین کی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کریں، چنانچہ اسی بنا پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس دور میں ہمارے مسلم زعماء کا عام طرز عمل یہی تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت و اقتدار کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے جو نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے ان کو وہ انہی کے فراہم کئے ہوئے نسخہ کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرتے تھے مسلمانوں میں دو الگ الگ جماعتیں قائم تھیں جن میں سے ایک قومیت کے سہارے پر چل رہی تھی اور دوسری نے وطنیت کی تحریک کو اس توقع پر اپنا یا تھا کہ جب یہ اپنے مقصد یعنی انگریزوں کے اخراج پر پہنچی ہوگی تو اس سے خود بخود ہمارے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے لیکن اس اختلاف کے باوجود ان دونوں کا مطمح نظر قریب قریب ایک ہی تھا، یہ دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو ایک فریق اپنے نظریہ کے مطابق اس کے لیے بلا قید و شرط ساعی تھا اور دوسرا اس شرط کے ساتھ اس پر آمادہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کے لئے کچھ تحفظات کا بند و بست کر دیا جائے چنانچہ اسی فریق کے مطالبہ و اصرار سے اس دور میں یہاں کی وطنی جماعتوں کے ساتھ ان کے

کچھ سمجھوتے کے معاہدے وغیرہ بھی ہوتے رہے جن سے اس دور کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔ بہر حال ایک طویل عرصہ تک دونوں فریق اپنے اپنے طور پر اسی کے لیے کوشاں رہے لیکن جب ۱۹۳۵ء کے آئین کے نفاذ کے بعد جمہوری طرز حکومت کا تھوڑا سا تجربہ سامنے آیا تو ایک فریق نے تو اس تجربہ کی ناخوشگواری کو فوراً محسوس کر لیا اور اس نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ وہ اس کے مزید تجربہ پر اپنا وقت ضائع نہ کرے لیکن اب بھی اس نے وہ صحیح راہ عمل اختیار نہیں کی جس کا دین متقاضی تھا بلکہ اس کی بجائے اس نے اپنا زور قوم پرستی کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے پر صرف کیا اور انہی کے تحت اس نے تقسیم ہند کی تحریک شروع کر دی جس میں تھوڑے دنوں کے بعد اسے کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔

لیکن دوسرا فریق جمہوریت کے اس ناقص تجربہ سے بددل اور مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے بخیالِ خویش یہ سمجھا کہ ناقص جمہوریت کا یہ پہلا تجربہ ہے اور تجربہ بھی ایسا کہ انگریز شر اس کے پھیلانے کے لیے ابھی بدستور موجود ہے اس لیے اس کے نتائج کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں صبر سے کام لیا جائے، جب جمہوریت اپنی کامل شکل میں نافذ ہو گی تو اس وقت اس سے اس کے صحیح متوقع نتائج برآمد ہوں گے اور وہ اللہ کے فضل سے اچھے ہی ہوں گے چنانچہ یہ گروہ بدستور اپنی راہ پر گامزن رہا بلکہ پیچھے ہٹنے والوں کی بزدلی کو چھپانے یا اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔

تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی عام سرگرمیاں کچھ اسی طرح کی تھیں، وہ یا تو قومی رنگ میں رنگے ہوئے تھے یا وطنی رنگ میں۔ رہی یہ بات کہ وہ اپنے

دینی فرائض کو ٹھیک طور سے محسوس کرتے اور دین ہی کے مطابق اپنے دنیاوی مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کرتے تو بلا شبہ ان میں ایسے افراد بھی رہے ہیں جو اس طرزِ فکر کے حامل اور اسی کے لیے عملاً کوشاں رہے ہیں لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کے طرزِ فکر کا تعلق ہے وہ اس دینی طرزِ فکر سے ہمنوائی کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ عام طور سے ان کا حال یہ تھا کہ اگر کچھ لوگوں نے اس طرزِ فکر کی دعوت بھی دینی چاہی تو ان کے لیڈروں نے اس کو بے وقت کی شہنائی سے تعبیر کیا اور اس کے لیے حالات کی ناسازگاری کو عذر بنا کر اپنے کان اس کی طرف سے بند کر لیے جس کا نتیجہ بھی بہت جلد مسلمانوں کے سامنے آگیا۔ ان دونوں جماعتوں کی مساعی بار آور ہوگئیں پاکستان بھی قائم ہوگیا اور ہندوستان کو بھی آزادی نصیب ہوئی لیکن جہاں تک مسلمانوں کی قسمت کا تعلق ہے وہ صرف ناکامی سے آشنا ہوئی۔ ہندوستان میں چار کروڑ مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی تفصیل و توضیح کا محتاج نہیں ہے رہا پاکستان کا معاملہ تو اگر کامیابی و ناکامی کے دینی تصور کو سامنے نہ بھی رکھا جائے جس کے لحاظ سے تنہا پاکستان کا قیام کوئی خوش آئند بات نہیں ہو سکتی جب تک کہ واقعی وہاں اسلامی نظام حکومت قائم نہ ہو کیونکہ اسلام کے نقطہ نظر سے اصل کامیابی یہی ہے، خالص دنیاوی نقطہ نظر سے بھی ہم قیام پاکستان کو کسی طرح بھی کامیابی کا ہم معنی قرار نہیں دے سکتے جبکہ جن خطرات و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، وہ پہلے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ اب بھی پاکستان کے رہنے والوں کو جیسا کہ خود ان کے اعلانات و بیانات سے ظاہر ہے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ تو ظاہر ہی بات ہے کہ ان کے جسم کا نصف کے قریب

حصہ خود ان کے بقول انہی خطرات کے منہ میں ہے، اگر یہی کامیابی ہے تو پھر آخر ناکامی کس چیز کا نام ہے!

تقسیم کے بعد

اب آیئے دیکھیے تقسیم کے بعد ہمارا کیا حال ہے۔ کیا واقعی ہم نے ان انقلابات سے جو اب تک پیش آچکے ہیں کوئی سبق سیکھا ہے اور اس کے مطابق ہمارے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔

تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا جو طرزِ عمل ہے وہ اس طرزِ عمل سے کچھ مختلف نہیں ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں نے اختیار کیا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ بدتر ہے۔

انگریزوں کی آمد کے وقت مسلمانوں میں خواہ کتنی ہی عملی خرابیاں پیدا ہوگئی ہوں لیکن اس وقت ان کے دلوں میں دین کی محبت اور اس کی عظمت کا احساس بہت کافی حد تک باقی تھا اور قومی غیرت و خودداری بھی ان میں بہت کچھ موجود تھی اس لیے اگر وہ انگریزی تہذیب و تمدن کی طرف بڑھے بھی تھے تو بہت کچھ جھجکتے ہوئے اور ساتھ ہی وہ چلتے چلتے بار بار مڑ مڑ کر اپنی ان دینی اور قومی روایات اور یادگاروں پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ حسرت کے ساتھ ڈال لیا کرتے تھے جن کو وہ پیچھے چھوڑے جا رہے تھے اسی لیے ان کی قدم کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ جایا کرتی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان میں جو لوگ زمانہ سازی میں بہت پیش پیش تھے ان کو بھی علانیہ اس کی جرأت نہیں ہوا کرتی تھی اور وہ دنیاداری کرنے کے لیے بھی اس بات پر مجبور رہتے کہ پہلے اس پر دینداری

کا خول چڑھائیں اور اس کے بعد اسے اختیار کریں۔

لیکن اب صورت حال اس سے بھی مختلف ہے۔ انگریزوں کے طویل دور غلامی میں قومی خصوصیات بہت کچھ مٹ گئیں یا مضمحل ہوگئیں اور اسی طرح دینی غیرت و حمیت کو بھی اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں پیہم صدمات پہونچتے رہے اس لیے وہ بھی بے روح اور بے جان ہو کر رہ گئی نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان بے روک ٹوک پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ زمانہ سازی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں پھر اسی کے ساتھ خود ہماری غلطیوں کی وجہ سے حالات بھی بہت مجبور کن ہوگئے ہیں جن میں واقعی زمانہ سازی سے اپنے کو محفوظ رکھنا بڑا ہی مشکل اور دشوار کام ہے۔

تقسیم سے چند لمحے پہلے تک مسلمان پھولے نہیں سماتے تھے کہ اللہ نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ جو لوگ آزادی کے دل دلدادہ تھے وہ اس بات پر خوش تھے کہ انگریز اپنی نحوستوں کے ساتھ اس ملک سے رخصت ہو رہا ہے جو ان کے بقول مسلمانوں کی ہر طرح کی خرابیوں کا تنہا ذمہ دار تھا اور جو لوگ اپنے ہر دکھ کا علاج محض یہ سمجھتے تھے کہ انکی کوئی قومی طین نصیب ہو، وہ اس بات پر مسرور ہو رہے تھے کہ کچھ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر محض فضل رب سے انھیں ایک جنت ارضی حاصل ہو گئی ہے جہاں پہونچکر وہ جیتے جی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مزا لوٹیں گے یا اگر بخت کی نارسائی کی وجہ سے وہاں نہیں پہونچ سکیں گے تو کم از کم اس کی عطر بیز اور روح پرور ہوائیں ہی ان کے غم کدوں میں ان کی فرحت و مسرت کا

ساماں بہم پہونچاتی رہیں گی۔ اس وقت ان میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی یہ مسرتیں کتنی عارضی ہیں اور مستقبل کے پردے میں ان کے لیے کتنی بھیانک الم ناکیاں چھپی ہوئی ہیں لیکن عین اس وقت جب فضا فرحت و مسرت کے قہقہوں سے گونج رہی تھی بلکہ مسرت پوری طرح اپنے شباب پر بھی نہیں پہونچنے پائی تھی کہ فضا آہ و بکا کے شور سے معمور ہو گئی اور اب جو مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو یہ ان کی ہی آہ و بکا کا شور تھا جو ہر چہار طرف سے برپا ہو رہا تھا۔ یہ رنگ میں بھنگ کا پہلا تجربہ تھا جو ان کو پیش آیا اور جس نے ان کو پریشانی اور حیرانی کے ایک وسیع سمندر میں غوطہ لگاتے ہوئے چھوڑ دیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا، یہ جو کچھ پیش آیا بہر حال وہ جنون کی عارضی حالت تھی جو ہند و پاکستان دونوں پر بیک وقت طاری ہوئی تھی اور دونوں جگہ اس نے کم و بیش ایک ہی طرح کا اثر دکھلایا تھا لیکن اس حالتِ جنون کے فرو ہونے پر بھی جو حالات ان کے سامنے آتے گو وہ واقعات کا قدرتی نتیجے تھے لیکن عام مسلمانوں کے لیے جو اب تک جوش کی گمانیوں میں مبتلا تھے، بالکل غیر متوقع اور ساتھ ہی حد درجہ قلق افزا اور مایوس کن تھے۔ جو لوگ پاکستان کے داعی اور علم بردار تھے انھوں نے اپنے جوش و خروش کے زمانہ میں کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی کہ پاکستان کس کے لیے ہوگا اور ہندوستان میں رہ کر اس کے قیام سے انھیں کیا فائدہ پہونچےگا لیکن اب جب ان کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ پاکستان جن کو ملنا تھا مل گیا لیکن ان کی قسمت میں اُسی سرزمین میں رہنا لکھا ہے

جس میں رہنے کے تصور اور اس کے منطقی تقاضوں سے وہ بالکل خالی الذہن تھے اور انہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے جن سے کل تک ان کی لڑائی تھی، اور جو اب ان کے حاکم ہیں اور قدرتی طور پر تقسیم اور تقسیم کرانے والوں سے خفا اور برہم ہیں۔ یہ منظر ان کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور بھیانک تھا۔ چنانچہ وہ اس کی تاب نہ لا کر یا تو بد حواسی کے ساتھ پاکستان کی طرف بھاگنے لگے یا اگر مصلحتیں اور مجبوریاں ان کی زنجیرِ پا بن گئیں تو وہ عاجزی اور بے کسی کے ساتھ انہی لوگوں کی دہائی دینے میں مصروف ہو گئے جن سے کل تک وہ خود مصروفِ پیکار رہتے۔ ان دو رستوں کے سوا ان کو کوئی اور رستہ ہی سجھائی نہیں دیا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہے تھے اس کا انجام اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ تو اس فریق کا حال ہوا جو قیامِ پاکستان سے اپنی تمام امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھا لیکن دوسرا فریق جو اب تک سب کچھ ہندوستان ہی کے لیے کرتا رہا تھا یہاں تک کہ اس نے اس کے مقابلہ میں دین اور اس کے صریح تقاضوں کی بھی بسا اوقات کوئی پروا نہیں کی تھی۔ اس کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوا۔ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی یہاں جنون کی جو آندھیاں چلیں وہ اس کا کوئی امتیاز نہیں کر سکیں کہ ان کی لپیٹ میں کون آ رہا ہے۔ مسلمان خواہ وہ لیگی رہے ہوں یا قوم پرور سب کو کم و بیش ایک ہی انجام سے دوچار ہونا پڑا، اور جب یہ طوفان اپنی حد کو پہنچ کر ختم ہوا تو اس وقت بھی اس فریق نے پایا تو یہ پایا کہ ان کے دوستوں کی نگاہیں خود ان سے

بھی بھری ہوئی ہیں اور ان کی سابقہ قربانیوں یا وفاداریوں کا اگر کچھ صلہ ہے تو صرف یہ کہ ان کے شکوہ وشکایت پر نگاہیں کچھ شرم سے نیچی کر لی جائیں اور بس۔ یہ منظر اس فریق کے لیے انتہائی یاس وحزن کا موجب ثابت ہو رہا ہے اس لیے ان کے لیے بھی چارہ کار یہی ہے کہ یا تو وہ مایوس ہو کر گھروں میں بیٹھ رہیں کیونکہ ان میں سے کتنوں کی غیرت اسے گوارہ نہیں کرتی کہ جس پاکستان کے قیام کی انھوں نے مخالفت کی تھی وہ اسی کو اپنی جائے پناہ بنائیں یا پھر سب کچھ بھلا کر پہلے گروہ کی طرح اپنے کو جدید حالات اور ان کے تقاضوں کے لیے تیار کریں۔

مسلمانوں کی اکثریت انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کا عام طرزِ عمل کچھ اسی قسم ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ ان کے حوصلے پست ہو گئے ہیں، مایوسی ان کے دلوں پر چھا گئی ہے اور اب وہ اس کے سوا اپنے لیے کوئی چارہ کار ہی نہیں پاتے کہ ہندوستان میں رہنا ہے تو جس طرح بھی ہو وہ یہاں کی اکثریت کو خوش کریں چنانچہ دیکھتے دیکھتے ان کے لباس، معاشرت، نام اور طرزِ کلام وغیرہ میں تبدیلیاں واقع ہوتی جا رہی ہیں اور ظاہر کے ساتھ ان کا باطن بھی تیزی کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے، بڑے بڑے سورما جو قوم پرستی پر ایمان رکھتے تھے آج ان میں اتنی بھی جرأت نہیں ہے کہ وہ قومیت کا بھی جو ایک جائز چیز ہے نام لے سکیں۔ بڑے بڑے مجاہد جنھوں نے برطانیہ عظمیٰ کی شہنشاہیت کو چیلنج کیا تھا اب اپنے کو اس کے لیے مجبور پا رہے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہو اس پر آمنّا و صدقنا کہیں اور خاموش ہو جائیں۔ ہم میں نئے نئے مفسر پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک تمام ادیان یکساں طور سے حق ہیں اس لیے یہ حماقت کا کام ہے کہ مسلمان

کسی متعین دین یا اس کی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے فکر مند ہوں، ہم میں نئے نئے مورخ پیدا ہو رہے ہیں جن کی تحقیق یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کوئی مخصوص چیز ہے ہی نہیں، ہندوستان میں جو تہذیب رائج ہے یہی بعینہٖ اسلامی تہذیب ہے، ہم میں نئے نئے شارحِ دین پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک دین و سیاست الگ الگ چیزیں ہیں اور مسلمانوں کا کام محض اتنا ہے کہ وہ مسجدوں میں جاکر نماز ادا کر لیا کریں یا شادی و بیاہ کے کچھ مخصوص طریقے جن کو دینی کہا جاتا ہے اختیار کر لیا کریں اور اپنے بقیہ کام جس دنیاوی طریقہ سے چاہیں انجام دیں، ہم میں نئے نئے محقق پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک لادینی ہی اصل دین ہے اس لیے وہ یا تو لادینی جمہوریت کے داعی و مبلغ ہیں یا سوشلزم اور کمیونزم کے۔ غرض نئے نئے فتنے برپا ہو رہے ہیں اور مسلمان تیزی کے ساتھ ان میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جن لوگوں پر اصلاحِ حال کی سب بڑی ذمہ داری ہے وہ یا تو یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں یا پھر وہ خود اپنے طرزِ فکر و عمل سے ان فتنوں کی تقویت کا باعث بنتے جا رہے ہیں اور ان میں سے کتنوں کا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ اگر کسی گوشے سے اس صورتِ حال کے خلاف کوئی بے چینی اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ اپنی پوری کوشش اس کے فرو کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ مذہب اور مصلحت کے نام پر کیا جاتا ہے۔

حیف گر ہیں امروز بود فردائے

مسلمانوں کی یہ حالت کوئی مخفی چیز نہیں ہے یہ کم و بیش ہر شخص کی حس ہیں ہم بھی داخل ہیں، اپنی ہی داستان ہے اس لیے اس کی زیادہ تفصیل میں پڑنے کی ضرورت

نہیں ہے البتہ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ ہماری یہ حالتِ زبوں اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اس پر غیروں کو بھی ترس آنے لگا ہے ذیل کے دو اقتباس ملاحظہ فرمایئے

مسٹر جے پرکاش نرائن نے مسلم قوم کی حالت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے

"مسلم آبادی اتنی زیادہ بزدل اور بے ہمت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے معتقدات کے مطابق عمل کرنے کی جرأت نہیں کرتی، ان کو یہ خوف ہے کہ اگر وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کریں گے تو ان کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی"

ماسٹر تارا سنگھ نے جیل سے رہائی کے بعد حسب ذیل الفاظ میں جیل کے مسلمان قیدیوں اور ملازموں کا حال بیان کیا تھا۔

"میں المورہ جیل میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سب مسلمان قیدی اور مسلمان سپرنٹنڈنٹ جیل میں "رگھوپتی راگھو راجا رام" کا گیت گاتے تھے اور ان میں کوئی بھی نماز نہیں پڑھتا تھا میں نے ان سے سوال کیا آپ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں لیکن ان کا حوصلہ اس قدر گر چکا تھا کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے"

اور یہ واضح رہے کہ یہ بیانات آج سے کچھ زمانہ پہلے کے ہیں جبکہ مسلمانوں کا حالِ زبوں دیکھ کر بہت سے دیکھنے والوں کو حیرت بھی ہوتی تھی اور ترس بھی آتا تھا لیکن چونکہ اب یہ ایک روزمرہ کی بات ہوگئی ہے اور نگاہیں اس کے دیکھنے کی عادی بن چکی ہیں اس لیے اب اس طرح کے بیانات بھی شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے میں آسکتے ہیں البتہ مسلمانوں کی حالت کا مذکورہ نقشہ کچھ پہلے سے زیادہ وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں مسلمان شروع سے لے کر اب تک مبتلا رہے ہیں۔
ان کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو مسلمانوں کی موجودہ روش پر جو وہ الیکشن کے سلسلہ میں اختیار کیے ہوئے ہیں مطلق حیرت نہ ہوگی۔ دُنیا کی کوئی قوم بھی ہو جب اپنے بنیادی معتقدات و تصورات کو ترک کر دیتی ہے تو وہ لامحالہ ذلت و خواری کا شکار ہو جاتی ہے۔ کوئی قوم اپنی خصوصیات کو چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی اور ذلت و خواری کا یہ خاصہ ہے کہ لوگ یا تو اضمحلال و پژمردگی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں حالات کے مقابلہ کی ہمت و جرأت باقی نہیں رہ جاتی یا اگر وہ کچھ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو اس طور سے کہ وہ اپنی قومی روایات و خصوصیات کے ساتھ اپنی غیرت و حمیت کو بھی بالائے طاق رکھ دیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی خوشامدیں کر کے اپنی زیست کا یا کچھ زیادہ حوصلہ ہو تو اپنی انفرادی دنیاوی عزت و سربلندی کا سامان کر لیں یا بہت زیادہ حوصلہ سے کام لیں تو اپنی قومی تنظیم کے ذریعہ اپنی منتشر قوتوں کو حالات کے مقابلہ کے لیے جمع کرنے کی فکر کریں خواہ اس کا نتیجہ اچھا ہو یا برا، چنانچہ یہی سب کچھ ہندوستان میں مسلمانوں کے ضمن میں بھی رونما ہو رہا ہے زیادہ تر لوگ پژمردگی میں مبتلا ہو کر ہاتھ پاؤں چھوڑ چکے ہیں اور جو لوگ کچھ متحرک ہیں ان کے سامنے دو ہی راہیں کھلی ہوئی ہیں یا تو وہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی کا ساتھ دیں اور اس بات کی مطلق پرواہ نہ کریں کہ ایسا کرنا دینی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے عمومی فائدہ و نقصان کے پہلو سے صحیح ہوگا یا غلط۔ یا پھر قومی بنیادوں پر اپنی تنظیم کی فکر کریں، رہی وہ روشن راہ

جسے اختیار کر کے وہ اپنی موجودہ بدبختیوں کا دور کر سکتے ہیں اور جس کا اختیار کرنا ان کا اصلی اور حقیقی فریضہ بھی ہے تو اس کی نہ ان کو کوئی فکر ہے اور نہ ہمت۔

مسلمانوں کی بنیادی غلطی

ہمارے نزدیک جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ دین کو اپنے جملہ معاملات کا رہنما قرار دیں کیونکہ اسلام (جس کے وہ ماننے کے مدعی ہیں) دنیا میں آیا ہی اس دعوی کے ساتھ ہے کہ وہ انسانی مسائل کا آخری حل ہے اور اس کے ماسوا انسان نے اپنے مسائل کے حل کے لیے جتنے طریقے بھی سوچے ہیں وہ سب فوز و کامیابی کی بجائے ہلاکت و خسران کا ذریعہ ہیں اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ بھی یہ بتلاتی ہے کہ ان کا اقبال و ادبار ہمیشہ اس جانب کے ساتھ بندھا ہوا رہا ہے کہ دین کے ساتھ ان کا رشتہ ترک و اغماض کا رہا ہے یا محبت و شیفتگی اور عملی تعلق کا۔ لیکن بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان نہ صرف جملۃً دین سے غافل ہو گئے ہیں بلکہ ان میں کثرت سے ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں جن کا دین کا تصور ہی بہت ناقص و محدود ہے وہ سمجھتے ہیں کہ دین محض چند مخصوص قسم کی عبادات و رسم و رواج کا نام ہے اور اس کا کوئی تعلق انسان کے عمومی مسائل سے نہیں ہے۔ ایسا سمجھنے والے کچھ تو جاہل عوام ہیں جن کو اول تو بتایا ہی یہ گیا ہے کہ رسم و رواج کے تحت جو کچھ وہ کرتے ہیں اپنے

دین اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور دوسرے وہ جن لوگوں کی طرف عقیدت کی نظریں اٹھاتے ہیں، بد قسمتی سے ان کا عملی نمونہ بھی انھیں دین و دنیا کی تفریق ہی کا سبق پڑھاتا ہے اس لیے یہ بے چارے دین کے بارے میں یہ تصور رکھنے پر مجبور ہیں اور کچھ جدید تعلیم یافتہ ہیں جنھوں نے اپنا تمام تر وقت مغربی علوم وفنون کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور اسلام کے بارے میں ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں تک محدود ہے اس لیے ان کا تصور، دین کے بارے میں اہلِ مغرب کے تصور سے کچھ مختلف نہیں ہے یعنی مذہب ان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک شعبہ ہے حالانکہ اسلام کی تعلیمات کو سرسری طور سے دیکھنے کے بعد اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے متعلق یہ تصور رکھنا غلط ہے اس وقت کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے لیکن اس تصور کی غلطی کسی لمبی چوڑی بحث کی بجائے صرف اتنی بات سے اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے کہ جس کلمہ کا اقرار کرکے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے مجرد وہ کلمہ اس کی زندگی کو اجتماعی مسائل سے مربوط کر دیتا ہے بشرطیکہ اس نے شعور کے ساتھ اس کا اقرار کیا ہو۔ اس کلمہ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو ماننے والا اللہ تعالیٰ کو اپنا حقیقی معبود اور فرمانروا تسلیم کرے، پس جب ایک شخص اس کلمہ کو ایک بار صدقِ دل سے تسلیم کرلے تو اس سے خود بخود چند اُصولی باتیں متعین ہو گئیں مثلاً اب اس کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ۔

(۱) اپنے کو حاکمِ مطلق سمجھے اور خدا کے احکام سے بے نیاز ہو کر حکومت و

فرمانروائی کرے اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے عقیدہ کی علی الاعلان تردید کرتا ہے
أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس
نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے -

(۲) وہ خدا کے سوا کسی فرد یا مجموعۂ افراد کے لیے خواہ وہ علما، وفضلاء
ہوں یا جمہور یعنی عوام الناس، یہ حق تسلیم نہیں کرسکتا کہ وہ خدا کی کسی سند کے
بغیر محض اپنی عقل کی روشنی میں یا رایوں کی کثرت کی بنیاد پر کوئی قانون بنائیں
اور اسے نافذ کریں کیونکہ اس کے معنی بھی یہی ہو سکتے ہیں کہ خدا کی جو
حیثیت اس نے تسلیم کی ہے اسے وہ دوسروں کو دے رہا ہے چنانچہ
اسی بنا پر اہل کتاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے -

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ - انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور اپنے راہبوں کو "رب" بنا لیا ہے -

اور اس کی تشریح حدیثوں میں یہی کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے علماء، وفقہاء
کی باتیں بغیر کسی سندِ الٰہی کے مان لیا کرتے تھے اور یہی ان کو رَب بنانا
ہے جو خالص خدا پرستی کے منافی چیز ہے -

غرض یہ مختصر کلمہ اپنے اندر بہت سی اصولی ہدایات رکھتا ہے جن کا
موجودہ مسائل اجتماعی سے بہت گہرا ربط ہے اس لیے آپ خود غور کریں
کہ یہ کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے کہ مذہب ایک پرائیوٹ معاملہ ہے
اور اس کا عمومی واجتماعی مسائل وامور سے کوئی تعلق نہیں ہے -

یہ تو تفریق دین و دنیا کے بارے میں دینی نقطہ نظر کا حال ہے اور اگر

آپ عقلی طور سے غور کریں تو اس سے بھی اس تصور کی غلطی واضح ہوسکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر مہمل بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور پرائیوٹ معاملات میں تو خدا کی ہدایت و رہنمائی کی ضرورت محسوس کریں لیکن اجتماعی زندگی کے وہ معاملات جو ان سے کہیں زیادہ وسیع مشکل اور پیچیدہ ہیں ان میں ہم اس کی ہدایت و رہنمائی سے بے نیاز ہو جائیں یا اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے مسائل میں تو ہماری رہنمائی فرمائے لیکن اس کا وجود عین مشکل میں ہمارا ساتھ چھوڑ دے؟ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ یا تو خدا کے وجود اور اس کی ضرورت کا سرے سے انکار کر دینا چاہیے، ایسا خدا کس کام کا ہوسکتا ہے جس سے ہماری اصلی ضرورت ہی پوری نہ ہوسکے اور اگر اس کی کچھ ضرورت ہے تو پھر اس کو اس حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ ہر آن ہمارا خدا ہے اور ہم اپنے جملہ معاملات میں اس کی ہدایت و رہنمائی کے محتاج ہیں۔

اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جہاں ایک بار آپ نے خدا کو اس کے وسیع تر دائرۂ حدود سے خارج کیا آپ کے لیے کسی تنگ تر دائرہ میں بھی اس کے ساتھ رشتہ قائم کرنا کوئی آسان بات نہ ہوگی، اول تو نجی اور غیر نجی زندگی کی تقسیم ایک مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ انسان اگر کسی جنگل میں تنہا زندگی گذارنا چاہے تو ممکن ہے اس کی زندگی اس تقسیم کی پابند ہوسکے، لیکن اگر وہ انسانوں کی طرح انسانوں کے ساتھ رہتا ہے تو اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوسکتا جس کا تعلق کسی دوسرے انسان سے نہ ہو یا اس سے کسی دوسرے پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو یہاں تک کہ وہ کوئی

ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا جس میں کہیں نہ کہیں کوئی دوسرا انسانی وجود اس کے فکر و خیال سے متاثر نہ ہو رہا ہو۔ پس خدا کو نجی زندگی تک محدود کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ حقیقتاً اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی درجہ میں یہ تقسیم ممکن بھی ہو تو انسان کے جن معاملات کو پرائیوٹ یا مذہبی کہا جاتا ہے وہ اس کے دوسرے عمومی اجتماعی مسائل سے جن کو دائرۂ مذہب سے خارج کر دیا گیا ہے اس طرح پیوست اور مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے غیر متعلق کر دینا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے اجتماعی معاملات کو خدائی احکام و ہدایات سے الگ کر دینے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنی انفرادی یا عرفِ عام کی مذہبی زندگی میں بھی زیادہ دنوں تک مذہبی باقی رہ سکے چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تفریقِ دین و سیاست کی پالیسی جہاں جہاں بھی کارفرما ہے وہاں روز بروز مذہب زوال پذیر ہے اور یہ پہلو اُن لوگوں کے لیے خاص طور سے قابل توجہ ہے جو لادینیت (سیکولرزم) کو رحمتِ خداوندی سمجھتے ہیں یا تفریقِ مذہب و سیاست پر اس حیثیت سے مطمئن ہیں کہ اس طرح مذہب سیاست کی دست درازیوں سے محفوظ رہ کر خوب پھل پھول لا سکے گا۔

بہرحال یہ تفریقِ دین و دنیا کا تصوّر ایک نہایت غلط اور مہمل تصوّر ہے اس لیے مسلمانوں کو صاف صاف فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ کلّی طور سے احکامِ دین کی پیروی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں یعنی وہ اپنے انفرادی معاملات کے ساتھ اپنے اجتماعی معاملات کو بھی دین کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں

یا نہیں۔ اگر اس پر ان کا دل راضی نہیں ہے تو ان کے لیے کوئی مجبوری نہیں ہے وہ شوق سے اپنے لیے بے دینی کا جو رستہ بھی پسند کریں اختیار کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ دین کو چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں تو پھر ان کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے عمومی مسائل اور بالخصوص الیکشن کے ضمن میں جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ کہاں تک دین کے مطابق ہے اور ان مسائل کے بارے میں دین کی صحیح رہنمائی کیا ہے اور اس کے بعد جہاں تک ممکن ہو۔ اس کو اختیار کرنے کی فکر کرنی چاہیے اس کے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا ایک فضول سی بات ہے جس کی توقع کم از کم ان لوگوں سے نہیں کی جا سکتی جو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اسلام ہی پر مرنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ دانستہ طور پر اس وقت کسی معاملہ میں غیر اسلامی روش ہی پر کیوں نہ چل رہے ہوں۔

موجودہ الیکشن اور اسلام

اس اصولی گفتگو کے بعد کہ الیکشن وغیرہ جیسے مسائل دائرۂ دین سے خارج نہیں ہو سکتے، اب مختصراً یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ فی الواقع اسلام نے ان مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں، یہ ہدایات قرآن شریف کی اصولی تعلیمات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریحی اقوال اور آنحضرت صلعم اور خلفاء راشدین کے عملی نمونوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہیں؛ بلاشبہ اِس دور اور اُس دور کے حالات و مسائل میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے لیکن اگر یہ بات سچ ہے کہ معاملات کی نوعیت ہمیشہ یکساں

رہتی ہے اور فرق جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے ظاہری مظاہر و اشکال میں ہوا کرتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس دور کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس دور میں بھی ہمارے لیے ویسی ہی کارآمد ہو سکتی ہیں جیسی کہ اس وقت تھیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مرورِ ایام سے ہر پچھلی بات پرانی نہیں ہو جایا کرتی ہے انسانی زندگی کے کتنے معاملات و مسائل ہیں جو آج صدیوں کے بعد بھی ویسے ہی تر و تازہ ہیں جیسے اس وقت تھے اس لیے ان کے بارے میں جو بات اُس وقت صحیح ہو سکتی تھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ از خود اس زمانہ میں غلط ہو جائے بالخصوص وہ باتیں جو ہی تھا کے بجائے انسانی فطرت سے براہِ راست تعلق رکھتی ہوں، ان کے خواہ مخواہ بدل جانے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے، فطرتِ انسانی اب بھی ویسی ہی ہے جیسی اب سے ہزاروں سال پہلے رہی ہے اور اس کے متعلق احکام دینے والی ہستی وہ ہستی ہے جو فطرت کی باریکیوں سے واقف ہی نہیں بلکہ اس کا خالق بھی ہے اس لیے یہ احکام بدل نہیں سکتے ہیں۔

بہر حال اگر آپ قرآن و حدیث کا مطالعہ اس غرض سے کریں گے کہ ان سے آپ اپنے موجودہ معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایت و روشنی حاصل کریں تو آپ کو ان میں ہر طرح کی ہدایات نمایاں نظر آئینگی مگر ایسا نہ ہو تو اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ ہی سرے سے غلط ہو جائے گا کہ وہ خدا کا آخری ضابطۂ حیات ہے جو ہر زمانہ میں ہر طرح کی ضروریات کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک طرف عرصہ دراز سے ان ہدایات کا کوئی عملی ظہور

یا نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے جس کو دیکھ کر ہم ان کو متعین و مشخص کر سکیں اور دوسری طرف ہم صدیوں سے تفریق دین و دنیا کے سایہ میں زندگی گذار رہے ہیں اس لیے قدرتی طور پر ان ہدایات پر ہماری نگاہیں ہی نہیں ہیں یا اگر، ہوسکتی ہیں تو ہم ان کو زبردستی توڑ مروڑ کر اپنی ذہنی ساخت اور ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں ایسی حالت میں یہ ہدایتیں ہمارے کس کام آسکتی ہیں!۔

ابتدائی کار

بہرحال دین نے ہمیں الیکشن وغیرہ جیسے معاملات کے بارے میں بھی ہدایات دی ہیں اور انہی ہدایات پر عمل پیرا ہونا مسلمانوں کا اصلی فریضہ ہے اور ان کی ہی پیروی سے ان کے موجودہ مشکلات و آلام کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ آئیے ہم غور کریں یہ ہدایات کیا ہیں؟

ہمارے نزدیک۔۔۔۔ دینی حیثیت سے مسلمانوں کے کرنے کا جو کام ہو سکتا ہے اس کی ابتدا، اس بات سے ہوتی ہے کہ آئندہ انتخاب سے مسلمانوں کو کلیتہً الگ رہنا چاہیے۔ یہ صحیح راستہ پر چلنے کے لیے پہلا قدم ہے۔

یہ طریقہ ہمیں کیوں اختیار کرنا چاہیے اور اس سے کیا فائدہ یا نقصان پہونچ سکتا ہے اس پر ہم آئندہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے لیکن اس سے پہلے میں یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت الیکشن سے علیحدگی کا جو مشورہ دیا جا رہا ہے یہ اُس طرح کی علیحدگی نہیں ہے جس کو مسلمانوں کی اکثریت پہلے ہی سے اختیار کیے ہوئے ہے اور جس کی ہم اس سے پہلے مذمت بھی کر چکے ہیں۔ یہ دونوں علیحدگیاں بظاہر ایک سی

معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی علیحدگی کسی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ غفلت و بے پروائی کا نتیجہ ہے، حالات کے دباؤ نے مسلمانوں کو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ کر دیا ہے کہ وہ زندگی کے اہم ترین مسائل میں بھی کوئی حصّہ لینے کے لیے آمادہ نہیں ہیں، اور نہ وہ اس کے لیے حالات ہی کو کچھ سازگار پا رہے ہیں اس لیے وہ مجبوراً انتخابات سے بھی علیحدہ رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر حالات میں آئندہ تبدیلی واقع ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کس ذوق و شوق کے ساتھ ان میں حصّہ لیتے ہیں اور اس کے برعکس ہم جس علیحدگی کا مشورہ دے رہے ہیں وہ ایک مستقل فکر ہے جس کو غفلت و بے پروائی سے کوئی دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے اور یہ علیحدگی بے اختیاری نہیں بلکہ اختیاری ہے اور یہ ہر حیثیت سے بے تعلقی کے مترادف بھی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق ہی کی ایک قسم ہے۔ ع لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ۔

اس لیے محض ظاہری مشابہت کی بنا پر دونوں کو ایک قرار نہیں دیا جاسکتا۔

الیکشن کے دینی نقصانات

دینی نقطہ نظر سے ہمیں الیکشن میں کیوں حصّہ لینا نہیں چاہیے اس کے وجوہ ہمارے نزدیک بہت واضح ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ جب اسلام خود ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس کی پیروی اور اس کی قولی و عملی تبلیغ، ایک مسلمان کا سب سے اہم اور اصلی فریضہ ہے تو یہ اس کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس فریضہ کو بالائے طاق رکھ کر الیکشن میں حصّہ لے؟ اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ایسا کیے بغیر الیکشن میں حصہ لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

ایک مسلمان جیسا کہ اوپر ضمناً گذر چکا ہے خدا کی حاکمیت پر ایمان رکھتا ہے جو اور باتوں کے ماسوا اس کے بنیادی کلمہ کا براہِ راست اور اولین تقاضا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ الیکشن کا پورا ہنگامہ حاکمیتِ جمہور کا تماشہ ہے جس کا رشتہ کسی طرح کھینچ تان کر بھی حاکمیتِ خدا سے جوڑا نہیں جا سکتا، ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ حکومت و فرمانروائی کے جملہ اختیارات اصلاً خدا کے لیے مخصوص مانے اور بجز نائب ہونے کی حیثیت کے ان کا استعمال کسی حال میں کسی انسان کے لیے صحیح نہ سمجھے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ مجالسِ قانون ساز کے ممبران کامل خود مختار اور احکامِ الٰہی سے مطلق بے نیاز ہو کر قانون بناتے ہیں اور پھر اپنی پوری مختارانہ حیثیت میں ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ خدا کا نام کہیں درمیان میں بھولے سے نہیں آتا اور اگر اتفاق سے آ جاتا ہے تو اس کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے کیا آپ کو یاد نہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں کچھ سادہ لوح ممبران نے تجویز پیش کی تھی کہ آئین میں خدا کے نام پر حلف کا اقرار درج کیا جائے جو یقیناً ایک مہمل تجویز تھی کیونکہ جب سب کچھ اس سے بے نیاز ہو کر ہی کرنا ہے تو خواہ مخواہ اس کا نام لینے سے بجز اس کے اور فائدہ ہی کیا ہے کہ اس کو اپنی بغاوت پر گواہ ٹھہرایا جائے لیکن اس تجویز پر جو تقریریں کی گئیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اسمبلیوں کو اللہ اور اس کے قانون سے کیا نسبت ہے۔ یعنی ممبروں نے برجستہ کہا، بزعمِ خود صحیح کہا کہ جب خدا پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہے تو اسے ہمارے معاملات

میں دخل انداز ہونے کا کیا حق ہے اور کچھ ممبران نے تو اس موقع پر ایسے کلمات بھی استعمال کیے جن کو قلم پر لاتے ہوئے ہمارا دل ڈرتا ہے۔

یہ تو ایک بنیادی بات ہوئی لیکن اس کے ساتھ اگر آپ تفصیلات میں گھس کر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ الیکشن میں آپ جس نوعیت سے بھی حصہ لیں قدم قدم پر آپ احکام و ہدایاتِ شریعت کو پامال کر رہے ہیں۔ طریقۂ انتخاب، طریقۂ امیدواری، الیکشن کا پروپیگنڈا، وزارتیں یا پارٹیوں کی تشکیل، بحث و مباحثہ کا عام انداز اور اس طرح کی جملہ باتیں وہ ہیں جو یورپ کے موجودہ غیر خدا پرستانہ نظام زندگی سے حاصل کی گئی ہیں اور ان میں سے بیشتر چیزیں وہ ہیں جو کلیتاً یا جزءً اسلامی طرز فکر و عمل کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر طریقِ امیدواری ہی کو لیجیے جو الیکشن کا سنگِ بنیاد ہے یہ چیز اس زمانہ میں اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہہ کر کوئی شخص قدامت پسندی، رجعت پرستی اور پستیٔ فکر و خیال وغیرہ کے طعنوں سے بچ نہیں سکتا لیکن جب آپ اس پر اسلامی نقطہ نظر سے غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اسلام نے الیکشن کی اس بنیاد ہی کو ڈھا دینا چاہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت ہے کہ کسی ایسے عہدہ یا خدمت کی خواہش نہ کی جائے جس میں عزت و حکومت بھی ملی ہوئی ہو۔ آپ نے فرمایا۔

لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ	حکومت طلب نہ کرو کیونکہ اگر وہ تمھیں
اِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ غَیْرِ مَسْأَلَةٍ	بے طلب مل گئی تو اس کے سلسلہ میں تمھیں

أُعِنْتَ عَلَيْهَا وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا۔ (بخاری ومسلم)

اللہ کی طرف سے مدد ملے گی لیکن اگر تم کو طلب کے بعد ملی تو تم اس کے حوالے کر دیئے جاؤ گے۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے۔

إِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّي عَلَىٰ هٰذَا الْعَمَلِ أَحَدًا سَأَلَهُ وَلَا أَحَدًا حَرَصَ عَلَيْهِ۔

خدا کی قسم ہم حکومت کے منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کریں گے جو اس کا خواستگار ہو اور نہ ایسے شخص کو جو اس کی حرص کرے۔

یہ ہدایات ظاہر ہے ایک اسلامی نظامِ حکومت سے متعلق ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر طلب و امیدواری کسی غیر اسلامی نظامِ حکومت کے کسی اعزازی منصب کے لیے ہو تو اس کی قباحت اور کتنی زیادہ بڑھ جائیگی اور اسی سے اس بات کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے امیدواروں کی تائید و حمایت کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے کیسا ہوگا۔

اگر یہ ہدایات صحیح معنوں میں بروئے کار لائی جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا ہنگامۂ انتخاب خود بخود بہت کچھ سرد پڑ جائے گا کیونکہ انتخاب کا ہنگامہ زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کے دم قدم سے زندہ ہے جو عہدوں کے حریص اور بھوکے ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے کو پیش کرتے ہیں اور پیش ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی کامیابی کے لیے معلوم نہیں کیا کیا انسانیت و شرافت سے گری ہوئی حرکتیں کرتے ہیں، رہے وہ لوگ جو ان کے مقابلہ میں زیادہ اہل ہو سکتے ہیں تو وہ خود ہی اپنے کو اس ہنگامہ سے الگ رکھتے ہیں اور اگر وہ آگے

ڑھنا بھی چاہیں تو ان کو پوچھتا کون ہے۔

اور یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ شریعت نے اگر کسی منصب و اعزاز کی امیدواری کو اس طرح ممنوع و مذموم قرار دیا ہے تو یہ اس کی طرف سے کوئی متشددانہ بات نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ امیدواری طرح طرح کے فتنوں کی جڑ ہے۔ جو لوگ اس طرح کی خدمتوں کے لیے خود امیدوار بنتے ہیں وہ اپنے خلوص اور ہمدردئ خلق کا کتنا ہی ڈھنڈھورا کیوں نہ پیٹیں ان میں نہایت کمتر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پیش نظر واقعی خدمت ہو، عام طور سے وہی لوگ اُمیدوار بنتے ہیں جو اقتدار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اور اس اقتدار کو وہ تمام تر اپنی ذاتی نفع اندوزیوں ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں اس لیے اس کا دروازہ کھول دینے کے معنی یہی ہیں کہ اچھے لوگ کبھی ابھر کر سامنے نہ آسکیں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر خود غرض اور نااہلوں کا قبضہ ہو جائے۔

اور یہ بات بھی یاد رکھیے کہ امیدواری کے سلسلہ میں جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ امیدوار بطور خود کھڑے نہ ہوں بلکہ پارٹیوں کی طرف سے وہ متعین کیے جائیں، بلا شبہ ایسے کسی امیدوار کے بارے میں مقابلتہً کچھ زیادہ حسنِ ظن سے کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ جو پارٹی اسے امیدوار کھڑا کر رہی ہے اس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ کوئی اصولی پارٹی ہے اور وہ اگر خدا سے خوف و محبت کا تعلق نہیں رکھتی تو کم از کم اپنے اصولوں کی وفاداری میں پختہ ہے اور ان کے مقابلے میں وہ کسی شخصیت وغیرہ کی کوئی پروا نہیں کرتی ہے لیکن اس زمانہ میں عام طور سے

پارٹیوں کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ اہل تر اشخاص کو نامزد کریں گی بالکل عبث ہے۔ پارٹیوں میں ایسی پارٹیاں بھی ہو سکتی ہیں جو ویسے ہی اغراض دنیہ کے ساتھ قائم ہوئی ہوں جو خودغرض امیدواروں کے سامنے ہوتی ہیں اس لیے ان کے کھڑے کیے ہوئے امیدوار ظاہر ہے انفرادی امیدواروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ خطرناک تو ہو سکتے ہیں کیونکہ پارٹی کی پوری قوت ان کی پشت پر ہو گی ——— لیکن ان سے بہتر کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ اور جو پارٹیاں ایسی ہوں گی جن کے مقاصد کچھ بلند ہوں اور ان میں کچھ نسبتاً بہتر لوگ بھی شریک ہوں تو عام طور سے پارٹیوں کی تشکیل جس طرح عمل میں آتی ہے اور امیدواروں کے انتخاب میں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس پارٹی کے اچھے لوگ ہی اُمیدواری کے اہل سمجھے جائیں گے اور بُرے لوگ ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے جب کہ اس وقت تک عام تجربہ بھی اس کی تردید کر رہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی فی عامیں پارٹی کہلانے کی مستحق ہے تو اس میں کسی مخلص اور ایماندار آدمی کے رہنے کی گنجائش ہی بہت تھوڑی ہے بلکہ نہیں ہے۔ ہر ایسی پارٹی کا اولین مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی پارٹی کا ساتھ دے خواہ ایسا کرنے میں اسے حق اور اپنے ضمیر کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور ظاہر ہے اس شرط کو پورا کرنے والے سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ایماندار نہیں ہو سکتے اور اسی شرط کی تکمیل کی نسبت سے اس پارٹی میں آدمی کے درجات متعین ہوتے ہیں اس لیے

ایماندار لوگ اس کا رُخ بھی نہیں کر سکتے ؎

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اور اگر کوئی کسی "مجبوری" سے شریک بھی ہو جائے تو اسے ہمیشہ پچھلی ہی صفوں میں رہنا پڑے گا الا یہ کہ پارٹی کی کوئی مصلحت اسے آگے لانے پر مجبور کرے۔

الیکشن کے دینی مضرات پر اس وقت کسی مفصل بحث کا موقع نہیں ہے یہ ایک مستقل عنوان ہے جو کسی قدر فرصت کا طالب ہے انشاء اللہ اس پر تفصیلی گفتگو اور کسی موقع پر ہو گی فی الحال امیدواری کی اسی ایک مثال کو سامنے رکھتے ہوئے آپ اندازہ کریں کہ انتخاب کی وادی ایک مسلمان کے لیے کتنی پُر خار ہے جس میں قدم قدم پر اس کا دامن خار معصیت سے الجھتا ہے ۔۔۔ اگر اس حالت کے بعد بھی آپ کا شوق مجبور کر رہا ہو تو یہ آپ کی ہمّت ہے ہم اس سے روکنے کا حوصلہ کیسے کر سکتے ہیں البتہ اتنی درخواست کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے کہ اگر ہو سکے تو کبھی کبھی اسے ضرور یاد کر لیا کریں کہ آپ کون ہیں اور آپ دنیا میں کیا کرنے کے لیے آئے ہیں۔

تعامل کا عذر

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں لوگ دین کے صحیح تقاضوں سے بچنے کے لیے موجودہ تعامل کا جو عذر پیش کیا کرتے ہیں کچھ مختصراً اس سے بھی بحث کر لی جائے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک عرصہ سے انتخابات ہوتے آرہے ہیں اور ان میں عام مسلمان تو درکنار بڑے بڑے علماء و فضلاء نے

نہایت ذوق وشوق کے ساتھ حصہ لیا ہے اور اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد صوبہ جاتی و مرکزی اسمبلیوں میں شریک ہے۔ اس لیے اس تعامل کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ الیکشن میں حصہ لینا دینی نقطہ نظر سے کیسا ہے؟ یہ تعامل اس کے جواز و استحسان کی بڑی روشن دلیل ہے۔

یہ اعتراض زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے پیش کرنے والوں کی تعداد بڑی کافی ہے اس لیے ہمیں اس پہلو سے اس پر بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کے طرز عمل نے اس مسئلہ کے ضمن میں عوام کو کتنی شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے اور اس لیے ہم نہایت شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی حد تک اس مسئلہ کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر واضح کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کریں تاکہ ہم عند اللہ اور عند الناس اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش قرار پائیں۔

ہم اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ عام مسلمان اور ان کے ساتھ علماء نے بھی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد کا دلچسپ مشغلہ یہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رائے وہی ہے جو اس سے پہلے عرض کی گئی ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ چونکہ ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اس لیے اب یہ مسئلہ خارج از بحث ہو چکا ہے اور محض یہ بات کہ ایسا ہوتا رہا ہے اس کے جواز کی کوئی دلیل بن سکتی ہے۔ دین میں بلاشبہ تعامل کے اعتبار کا ایک درجہ ہے لیکن اس کے لیے اولین شرط دین کی مطابقت ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ کوئی چیز نہیں ہے خواہ اس میں مبتلا ہونے والے

کیسے ہی لوگ کیوں نہ ہوں۔ مومن صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند ہے، دوسروں کی اطاعت اور پیروی اگر ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جب وہ اس سے متصادم نہ ہو رہی ہو اور صرف اس شرط کے ساتھ شریعت نے دوسروں کی اطاعت واتباع کی اجازت دی ہے، چنانچہ اسی بنا پر قرآن مجید میں منکرین حق کے اس مقولہ کی جا بجا مذمت کی گئی ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ ان احکام کی طرف جو اللہ نے نازل کیے ہیں اور آؤ رسول کی طرف، تو وہ کہتے ہیں کہ جس روش پر ہم نے اپنے آباء کو پایا وہی ہمارے لیے کافی ہے

ایک مومن کی حقیقی شان ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو انھیں اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کا معاملہ تعامل کی صحیح تعریف میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ اعتراض کرنے والے غالباً اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اسی ہندوستان میں ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے جس میں علماء ہند کا عمل اس "تعامل" کے خلاف رہا ہے۔ ترک موالات کے زمانہ کو بھی زیادہ دن نہیں گذرے ہیں غالباً ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ ہندوستان

کے تمام مشاہیر علماء کے دستخطوں سے ایک "متفقہ فتویٰ" شائع ہوا تھا، جس میں متعدد شرعی دلائل کی بنا پر کونسلوں میں مسلمانوں کی شرکت کو ناجائز اور حرام قرار دیا گیا تھا اور یہ واضح رہے کہ یہ دلائل سب کے سب وقتی ہی نہیں تھے جو زمانہ کے بدلنے کے ساتھ بدل سکتے ہوں بلکہ ان میں سے متعدد دلائل بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور اِس زمانہ میں کم از کم۔ ان کے غلط ہو جانے کی نہ کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہمارے علم میں کوئی ایسی بات ہی آسکی ہے جس میں ان کے غلط ہو جانے کی کوئی توجیہ کی گئی ہو دراں حالیکہ اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں سے متعدد علماء رحمہ اللہ اب بھی بقیدِ حیات ہیں مثلاً اسی فتوی کی ایک دفعہ یہ تھی۔

"کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں جس کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرتِ مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسلم ممبران کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شواہد واقعاتِ ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے"

مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل یقیناً اس فتویٰ اور اس کے مطابق ایک عرصہ تک جو عملدرآمد رہا ہے اس کے خلاف ہے اس لیے بلاشبہ یہ ایک قابلِ غور مسئلہ ہے کہ اُس وقت کا یہ فتویٰ اور اس کے مطابق طرزِ عمل صحیح تھا یا ان کا اِس وقت کا

کا عمل جس کی تائید میں اب تک کوئی شرعی دلیل سوا اس "تعامل" کے ہماری نظر سے نہیں گذری ہے!

الیکشن عقلی نقطہ نظر سے

گذشتہ فصل میں ہم نے الیکشن کے بارے میں دینی نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی تھی، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر خالص عقلی بنیادوں پر غور کیا جائے کہ الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا دینی یا دنیاوی اعتبار سے کہاں تک مفید یا مضر ہو سکتا ہے۔

ہر چند دینی حیثیت سے اس مسئلہ کی وضاحت ہو چکنے کے بعد کسی اور نقطہ نظر سے بحث کی کوئی ضرورت یا گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے کیونکہ ایک مسلمان کے لیے اصلی اور حقیقی نقطہ نظر صرف دینی نقطہ نظر ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ کسی امر کے بارے میں جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا اختیار کرنا اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہے، تو ایک مسلمان کے لیے اس سے علحدہ رہنا ضروری ہو جاتا ہے خواہ اس کے اختیار کرنے سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ پہونچنے والے ہوں اور اس کا ترک کرنا کتنے ہی نقصانات کا موجب کیوں نہ ہو۔

مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو پھر ان کے لیے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔

ایمان نام ہی ہے بے چون وچرا اطاعت کا اور یہ خود قرآن مجید نے صراحت کی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

پس قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ مومن نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کریں۔

لیکن چوں کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے نزدیک دینی نقطہ نظر کی کچھ زیادہ اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے ان کے نزدیک ہر مسئلہ میں فیصلہ کن چیز صرف عقل ہو سکتی ہے حتی کہ جن لوگوں کی بحث وگفتگو دین سے شروع ہو کر دین ہی پر ختم ہو جانی چاہیے وہ بھی جب اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی گفتگو تمام تر عقلی ہی ہوا کرتی ہے اور وہ بھولے سے بھی دین کا نام درمیان میں نہیں آنے دیتے اس لیے ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر اس حیثیت سے بھی نگاہ ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دین جو کچھ چاہتا عقل کا فیصلہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔

(۱) ہندوستان میں کسی قومی کشمکش کا پیدا ہونا مسلمانوں کے دینی و دنیاوی دونوں طرح کے مصالح ومفاد کے خلاف ہے بلکہ نفس اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام کسی قوم کا نام نہیں ہے اور نہ اس کے نزدیک ایسے قومی مفادات جن سے قومی کشمکش پیدا ہوتی ہے قابلِ اعتبار ہیں۔ ایک مسلمان کا اصلی تعلق صرف

ان اصولوں سے ہوتا ہے جو اسلام نے پیش کیے ہیں اور ان کے لیے جد و جہد کرنا اس کا اصل مقصودِ زندگی ہے باقی رہا وہ ملک یا قوم جس سے اس کا پیدائشی تعلق ہوتا ہے تو وہ ان سے تعلقِ خاطر تو رکھ سکتا ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے لیے اپنے اصلی مقصودِ زندگی کو چھوڑ نہیں سکتا اور نہ کسی درجے میں نظر انداز کر سکتا ہے، پس قومی نقطہ نظر کو اصل بنا کر قومی حقوق کے لیے جد و جہد کرنا اسلامی نقطہ نظر سے کوئی صحیح بات نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے اسلام کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے مسلمانوں کے قوم پرستانہ نقطہ نظر کے تحت بہت کچھ پہونچ چکا ہے۔ آج ہندوستان میں اسلام غیر مسلموں کی نگاہوں میں حد درجہ مبغوض اسی لیے ہو رہا ہے وہ اسلام کو مسلمانوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تعلق ایک عرصہ سے جنگ و جدال کا رہا ہے اس لیے قدرتی طور پر وہ مسلمانوں کے ساتھ اسلام کو کسی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

اسی طرح قومی حقوق کے لیے یہاں کی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کشمکش کرنا دنیوی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے لیے [illegible] ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ان کو جو حقوق اس وقت تک حاصل ہیں وہ بھی اس کشمکش کی نذر نہ ہو جائیں ہندوستان میں مسلمان تقسیم کے بعد ایک نہایت قابلِ رحم اقلیت بن چکے ہیں جن پر ایک زبردست اکثریت کا زبردست تسلط قائم ہے اس اکثریت کا رویہ بلاشبہ بدلا جا سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان جامد قومیت کے

چھوڑ کر قولاً وعملاً ان اسلامی اصولوں کے داعی بن جائیں جو اپنے اندر دوسروں کو کھینچنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن قوم پرستی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی اس وقت ان کی مزید کشیدگی کا باعث ہوگا اور یہ چیز ان کے حقوق کے لیے نقصان پہونچانے کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی جیسا کہ واضح ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ الیکشن میں اپنے قومی حقوق کی خاطر حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کا انجام یہی ہو سکتا ہے جس کے وجوہ حسب ذیل اقتباسات سے بخوبی سمجھے جا سکتے ہیں۔

مولانا نورالدین صاحب بہاری ناظم جمعیتہ العلماء اپنے ایک مضمون "ہندوستان کے مسلمان کیا کریں" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ درست ہے کہ ان بزرگوں (گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمانڈ کے چند برگزیدہ وسیع الدماغ بزرگ) نے نیک نیتی سے اس ملک کو جمہوری سکولر قرار دیا، مگر اس سے زیادہ یقینی یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کا دماغ نہ سکولر ہے نہ جمہوری اور شاید اس ذہنیت کے پیدا ہونے میں عرصہ لگے۔ اگر اس مسئلہ کو اس طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہوگی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی حکومت اپنے لا اینڈ آرڈر کو اس وقت برسرکار لا سکتی ہے جبکہ اس کے نیچے کا عمو حکومت کی پالیسی سے دیانتدارانہ تعاون کرے، مگر ہمیں اس کا اقرار کرنا چاہیئے کہ

آج نیچے کے عمل کی اکثریت حکومت کی پالیسی کی نفاد ار ہیں اور خصوصًا اس مسئلہ میں...... پس اس تباہ کن پوزیشن میں نہایت سنجیدگی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غور کرنا ہے کہ آیا اس حق کو جو ملک کی برسر اقتدار پارٹی نے مسلمانوں کو دیا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے یا موجودہ ماحول و ذہنیت کے پیش نظر اس وقت تک کے لیے جب تک ملک کی اکثریت کی ذہنیت جمہوری اور سکولر کے ڈھانچے میں نہ ڈھل جائے اس وقت تک اس حق سے دست بردار ہو جایا جائے...... میری دیانت دارانہ سیاسی رائے ہے کہ تمام ملک کے مسلمانوں کو قطعًا اس حق سے دست بردار ہو جانا چاہیے اور آئندہ الیکشن میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا مقصدِ زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے شاید وہ اس رائے سے متفق نہ ہوں گے حالانکہ موجودہ فضا میں اس کی کامیابی کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، پھر بھی وہ دست بردار نہ ہوں گے اس لیے میں تمام مسلم عوام سے جو ووٹر ہیں درخواست کروں گا کہ وہ اعلان کر دیں کہ جب تک ملک کی ذہنیت جمہوری سکولر نہ بنے گی ہم اس حق کو جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے استعمال نہ کریں گے میرے نزدیک موجودہ فضا میں اس سے بہتر تباہی سے بچنے کی اور کوئی راہ نہیں ہے" (تیج ۹ اپریل ۱۹۵۰ء)

مولانا حامد الانصاری صاحب غازی نے جمیعتہ العلما، جون پور کے اجلاس میں اپنا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

"ہندو رہنما ۳۰ کروڑ ہندوؤں کی نئی تخلیق کا کام اپنے ویدوں اور دھرم شاستروں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، ہر نئی قوم کو نئی مہم کے لیے ایک نشانہ کی ضرورت ہوتی ہے ان لوگوں کے فیصلہ کے مطابق یہ نیا نشانہ ہند یونین کے ۴ ½ کروڑ مسلمان ہیں اور اس نشانہ پر ہندو قوم کو جمع کرنا ان کا نصب العین ہے۔

(گئو رکشا، جبریہ ہندی، کلیدی ملازمتوں سے مسلمانوں کی علیحدگی وغیرہ نعروں کو بطور مثال پیش کرنے کے بعد) یہ تمام باتیں صرف اس لیے آناً فاناً کی گئیں تاکہ مسلمان نشانہ بن سکیں اور تمام ہندوؤں کو اس نشانہ پر جمع ہونے کا موقع مل سکے......

سوال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی عقل کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہمارے دماغ کا فیصلہ یہی ہوسکتا ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ ہم نشانہ سے ہٹ جائیں اور نشانہ کو خطا ہونے کا موقعہ دیں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ ہم کم سے کم عبوری دور کے لیے سیاست سے مکمل دستبرداری کی دستاویز پر دستخط کریں اور اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں اس طرح گم ہو جائیں کہ اگر کوئی ہم کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے تلاش بھی کرنا چاہے تو ہم اس سے دستیاب نہ ہو سکیں۔" (مدینہ ۹ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء)

(۲) ہمارے نزدیک مسلمانوں کو اس وقت ہندوستان میں جو مصیبتیں درپیش ہیں ان کا ایک بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اب بھی ہندوستان میں اس حیثیت

کے مالک ہیں کہ ان کے ووٹ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتے ہیں ان کی اس حیثیت کو بہت سے لوگ ان کے لیے فالِ نیک سمجھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے حالات میں ایسا ہی ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ملک کے موجودہ حالات میں ان کی یہ حیثیت ان کے لیے بلائے جان ثابت ہو رہی ہے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے تحت یہ سمجھا جا رہا ہے —— اور یہ حقیقت سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت، ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں میں سے بعض سے زیادہ قریب اور بعض سے بہت زیادہ دور رہی ہے اور اسی اعتبار سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کی تائید یا مخالفت کا کیا انداز ہو گا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو پارٹیاں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی تائید وحمایت کسی حال میں حاصل نہیں ہو سکے گی وہ اس بات کے لیے رات دن کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو ہر ممکن ذریعہ سے تنگ اور پریشان کریں اور اس سے گوناگوں فوائد ان کے پیشِ نظر ہیں۔

پہلا فائدہ اس کا یہ ہو گا کہ مسلمان پریشان ہو ہو کر ترکِ وطن کریں گے اور اس طرح ان کے مخالفین کے ووٹ کم ہوتے رہیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ جو مسلمان یہاں رہنا ہی چاہیں گے وہ ان سے خوف زدہ ہو کر یا تو ان کا ساتھ دیں گے یا کم از کم ان کے مخالفین کی حمایت نہیں کریں گے اور یہ دونوں صورتیں الیکشن میں ان کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔

اور تیسرا زبردست فائدہ اس سے ان کو یہ پہونچے گا کہ وہ اس کی وجہ

سے عام پبلک میں جو بدقسمتی سے سخت فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار رہتے نیک نام ہوں گے اور اس سے ان کی آئندہ کامیابی کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اور چوتھا فائدہ یہ ہے کہ فسادات کی وجہ سے کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کا اعتماد متزلزل ہوگا اور یہ چیز بالواسطہ طور سے ان کے لیے مفید ہوگی۔

چنانچہ ملک کی یہ جماعتیں ان ہی فوائد کے لیے تقسیم سے لے کر اس وقت تک برابر اپنی فتنہ انگیزیوں میں مصروف ہیں اور اس وقت تک جتنے فسادات بھی ہوئے ہیں اُن سب میں ان کا زبردست ہاتھ رہا ہے اور یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ جو لوگ حالات سے ذرا بھی لگاؤ رکھتے ہیں وہ اس سے بخوبی آگاہ ہیں، تاہم ہم ذیل میں ایک غیر مسلم صاحب قلم کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ہم نے فسادات اور ان کے اسباب کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس سے غیر متعصب صاحب البیت" بھی متفق ہیں۔

اونکار ناتھ شاستری نے گذشتہ سال کے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں جو نیا ہند (الہ آباد) میں شائع ہوا تھا لکھا تھا۔

"ہندوستان میں سامپردایک (فرقہ وارانہ) دنگے کرانے میں ان جماعتوں (فرقہ پرست جماعتوں) کو کئی فائدے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اب بھی کافی تعداد ہے اور ان کے ووٹ چناؤ پر کافی اثر ڈال سکتے ہیں، مہاسبھا جانتی ہے کہ وہ ان کے ووٹ نہ حاصل کر سکے گی، اس لیے اگر مسلمان

یہاں سے چلے جائیں تو اس کا کام بن سکتا ہے۔ مسلمانوں کو نکالنے کے لیے اس نے پہلے تو یہ نعرہ لگایا کہ آبادی کی اولا بدلی کر لی جائے پھر اس نے جنگ کا نعرہ لگایا اور جب یہ دیکھا کہ ہندوستان اور پاکستان ایسی مورکھتا نہیں کریں گے تو اپنی ساری کوشش اس بات میں لگا دی کہ ہندوستان بھر میں ہندو مسلم دنگے ہو جائیں۔

آبادی کا تبادلہ ہونے پر کروڑوں آدمیوں کو کن کشٹوں کا سامنا کرنا پڑتا اس سے اسے کوئی غرض نہیں اور جنگ میں ہندوستان و پاکستان میں کتنی تباہی و بربادی ہوتی اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا مقصد تو کسی طرح مسلمانوں کو یہاں سے نکال کر ان کے بدلے میں آنے والے ہندوؤں سے یہ کہہ کر ان کے ووٹ حاصل کرنا تھا کہ دیکھو کانگرس تمہارا خیال نہیں کرتی تھی ہم نے تمہیں مسلمانوں کی غلامی سے چھٹکارا دلایا، اس کا آخری حربہ ہندو مسلم دنگے تھے، کیونکہ یہاں دنگوں میں جو ہندو حصہ لیں گے وہ نہ صرف مسلمانوں کی جان لیتے بلکہ ان کا مال بھی لوٹتے اگر اس لوٹ میں ان کے ہاتھ کچھ مال آ جاتا اور وہ پکڑے نہ جاتے تو مہاسبھا یہ کہتی کہ میرے کارن تمہیں یہ لابھ پہونچا اور اگر سرکار انھیں روکتی یا پکڑتی تو مہاسبھا ہندوؤں کو یہ سمجھاتی کہ کانگرس تمہاری دشمن اور مسلمانوں کی دوست ہے اسی طرح

جن ہندؤں کو سرکار گرفتار کرتی مقدمہ چلاتی اور سزا دیتی ان کے سمبندھوں (متعلقین) کے دل میں آپ ہی آپ سرکار اور کانگریس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی۔ غرض ہر حالت میں مہاسبھا اپنا فائدہ ہی فائدہ سوچتی تھی،،

اقتباسِ بالا کو پیشِ نظر رکھنے سے اس بات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ہمیں آئینِ ہند میں شہریت کا جو یہ حق دیا گیا ہے کہ ہم الیکشن میں مساویانہ حصہ لے سکیں وہ ہمارے خوش ہونے کے لیے تو بہت اچھا ہے لیکن اس کا استعمال ہمارے لیے بہت سے خطرات کا سرچشمہ ہے۔ اور اس کے بعد غالباً یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں اپنی عافیت مطلوب ہے تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اپنے اس حق سے خود اپنے ارادہ سے دست بردار ہو جائیں اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم فرقہ پرستوں کی ان چیرہ دستیوں سے جن کا آئے دن ان کو شکار ہونا پڑتا ہے ان کو نجات مل سکتی ہے، اور میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو تھوڑا بہت سکون آپ کو نظر آ رہا ہے اس کی وجہ سے آپ کچھ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان فرقہ پرستوں کی ذہنیتوں میں کوئی فرق واقع ہو گیا ہے، اول تو اس وقت ملک میں روٹی اور کپڑے کے مسائل نے وقتی طور سے اہلِ ملک کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے، جس میں فتنہ و فساد کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہ بانیانِ فساد کو ہے اور نہ عام پبلک کو۔ دوسرے ابھی الیکشن غیر یقینی ہونے کے ساتھ، کچھ دور بھی ہے، اس لیے اس وقت

صرف تیاریوں کا زمانہ ہے، مناسب وقت آنے پر جد وجہد تیز کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور تیسری بات یہ ہے کہ اس وقت بھی ان کا سلسلہ کچھ بند نہیں ہے کچھ نہ ہونے پر بھی ۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء سے ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۵۱ء[1] تک یعنی صرف ڈیڑھ ماہ میں، یوپی، سی پی، اور بہار وغیرہ میں سات جگہ فسادات برپا ہو چکے ہیں جن کا سبب آئندہ الیکشن کی تیاریاں ہیں اور یہ بات وزیر اعظم ہند تک کو تسلیم ہے۔ شعیب (حیدرآباد) نے ابھی حال میں لکھا ہے۔

"وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ حال ہی میں ہندو مہاسبھا نے فرقہ وارانہ فسادات کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ افواہیں پھیلا کر فسادات کا ایک نیا دور شروع کرانے کی سازش اس لیے کر رہی ہے کہ اصول، نظریہ اور عمل کے میدانوں میں تو وہ کانگریس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مگر فرقہ وارانہ فضا بگاڑ کر آگے انتخاب میں ووٹ ملنے کی امید کر سکتی ہے اور غالباً یہ توقع بھی کر سکتی ہے کہ اگر فسادات پھیلائے جائیں تو مسلم اقلیت بھی کانگریس پر بھروسہ ترک کر کے مہاسبھا کو نہ سہی دوسرے حریف عناصر کو ووٹ دے گی اور اس طرح مہاسبھائی امیدوار بالواسطہ فائدہ اٹھائیں گے"

---

[1] یہ سطریں فروری سنہ ۱۹۵۱ء میں لکھی گئی تھیں اس کے بعد جو واقعات پیش آرہے ہیں ان سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

پھر ان فتنہ پرور جماعتوں کی ان فتنہ پروریوں کے ساتھ یہ بات بھی آپ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تقسیم ملک کے بعد ان کے لیے یہاں کی فضا کتنی سازگار رہ گئی ہے اور اب ان کے اثر و اقتدار کا کیا حال ہے۔ عوام میں ان کو جو مقبولیت ہو سکتی ہے، اس کے تو خیر اسباب موجود ہیں لیکن خود حکومت میں ان کے اثر و اقتدار کا حال یہ ہے کہ اوپر وزیر ہند کی جس تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح کی تقریریں خود حکومتی محکمہ یعنی ریڈیو کے ذریعہ ملک میں نشر نہیں ہو پاتی ہیں جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود حکومت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نہیں چاہتے کہ ان جماعتوں کے خلاف ملک میں کوئی جذبہ مخالفت کا پیدا ہو اور وہ اس کے لیے وزیر اعظم کی تقریروں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، اِن جماعتوں کی اس حیثیت کو ذہن میں رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ محض مسلمانوں کا ووٹ اس وقت ان کی کتنی مصیبتوں کا باعث بنا ہوا ہے اور اس پر اس وقت کی حالت کو بھی قیاس کر لیجیے جب انتخابات کی ہماہمی عملاً شروع ہو جائے گی اور مسلمانوں کی حمایت یا مخالفت جو ابھی درجۂ احتمال و امکان میں ہے الیکشن میں حصّہ لینے کی صورت میں کھُل کر سامنے آ جائے گی اس وقت اس کا مخالفین پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے بلکہ واقعہ تو یہ ہے اگر یہی پہلی رہا ہے تو شاید اس وقت اس وقت کی تباہیوں کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے، خدا کرے ہم جن باتوں کا اندیشہ کرتے ہیں ان میں سے کوئی بات بھی پیش نہ آئے ہماری خوشی یقیناً اس میں ہے کہ اس بارے میں تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوں اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ غیب کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے

اور کارسازِ حقیقی کی کارسازیاں ہر قسم کے ظن وتخمین سے بالاتر ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ ازغیب ایسے اسباب فراہم کردے جن کی وجہ سے یہ حالات چشم زدن میں یکسر بدل جائیں، لیکن اگر خدانخواستہ مسلمانوں کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جس کا ایک اہم جزیہ ہے کہ مسلمان اپنی صحیح حیثیت کو پہچانیں اور اس کے تحت الیکشن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کریں تو اس وقت حالات کے پیشِ نظر نہایت پُر امید نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور مولانا نورالدین صاحب بہاری کے یہ الفاظ ہمارے ذہن و دماغ میں گونجنے لگتے ہیں۔

"اگر اس مسئلہ کو اسی طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہوگی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جاسکتا (لا سامح اللّٰہ")۔

(۳۴) الیکشن میں حصہ لینے کی تین ہی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی شکل یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیں اور اپنے طور سے امیدوار کھڑے کریں، دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے امیدوار علیحدہ کھڑے نہ کریں بلکہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کریں اور پھر اس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کی جدوجہد کریں اور تیسری شکل یہ ہے کہ مسلمان متحد ہونے کے بعد اگر بحیثیت قوم کسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ کرسکیں تو کسی منظم طریق کے مطابق الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں لیکن یہ تینوں شکلیں مسلمانوں کے لیے غیر مفید بلکہ مضر ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ہم تفصیل سے قومی تنظیم کے ضمن میں

واضح کرچکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ووٹ کا استعمال

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جتنی ممکن شکلیں ہیں ان میں کوئی شکل بھی ایسی نہیں ہے جسے اختیار کر کے مسلمان دینی یا دنیاوی حیثیتوں سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں، اب اس بحث کے بعد صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمان اگر آئندہ الیکشن میں کسی طرح خود اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوں تو وہ اپنے ووٹ دوسرے امیدواروں کے لیے استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں، اور ایسا کرنا ان کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ہوسکتا ہے۔

اس بارے میں بھی ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کی یہ شکل بھی صحیح نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے بلکہ بہت زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

پہلا نقصان تو یہی ہے کہ اس شکل میں مسلمان مختلف پارٹیوں کی آماجگاہ بن جائیں گے اور اس کشمکش میں ان کو نقصان کے سوا فائدہ کچھ نہیں پہونچ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی تنظیم نہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے ووٹ مختلف پارٹیوں کے بیچ تقسیم ہوجائیں گے اس لیے وہ کسی پارٹی کو خوش نہ کرسکیں گے اور نہ اس سے کوئی دنیاوی منفعت حاصل کرسکیں گے بلکہ اس کے برخلاف یہ بات بہت سی —— پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی اور اس سے بحیثیت قوم ان کو نقصان پہونچے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر جو وجوہ امیدوارانہ بننے کے سلسلہ میں مذکور

ہوئے ہیں وہ اس بات کے بھی متقاضی ہیں کہ مسلمان ووٹر کی حیثیت سے بھی الیکشن میں حصہ نہ لیں، مثلاً اگر مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ کسی باطل نظام کے تحت قائم شدہ اسمبلی کی ممبری کے لیے امیدوار بنیں تو ان کے لیے یہ بھی ناجائز ہوگا کہ وہ اس کے لیے کسی اُمیدوار کی تائید بھی کریں، اور اسی پر دوسرے وجوہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ان اسباب کے تحت ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو ووٹر کی حیثیت سے بھی آئندہ انتخاب سے علیحدہ ہی رہنا چاہیے، باقی رہی یہ بات کہ مولانا نوراللہ صاحب بہاری کے بقول جن لوگوں کا مقصدِ زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے، وہ بہرحال انتخاب میں کودیں گے اور اپنے ذاتی اغراض کے لیے مسلمانوں کو بھی اس آگ میں جھونکنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً ایسا ہوگا اور ہم اور آپ ایسے لوگوں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے، اس لیے ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور اگر آپ ہمارے نقطۂ نظر سے متفق ہیں تو آپ کو چاہیے کہ اپنی حد تک اس سے الگ رہنے کی کوشش کریں۔

الیکشن سے علیحدگی کے متوقع نقصانات

گذشتہ مباحث میں ہم نے شرعی اور عقلی دونوں طرح کی دلیلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا دینی حیثیت سے غلط اور دنیاوی اعتبار سے ہر طرح کے نقصانات کا موجب ہے ہمارا خیال ہے کہ ان مباحث کے بعد اب اس بات کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ ہم الیکشن کی علیحدگی کے نقصانات کا الگ جائزہ لیں اور ان پر

گفتگو کریں لیکن چونکہ الیکشن سے علیحدگی کا تصور کرتے ہی طرح طرح کے نقصانات کا ایک بھیانک منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ اچھے اچھوں کے قدموں میں بھی لغزش پیدا کر دیتا ہے اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ ہم خاص خاص نقصانات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کہاں تک اہم ہیں اور الیکشن میں حصہ لینے سے جو نقصانات ہم بیان کر چکے ہیں ان کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔

انفرادی نقصان

کچھ نقصانات تو ایسے ہیں جن کو آپ زیادہ سے زیادہ افراد کا انفرادی نقصان قرار دے سکتے ہیں مسلمانوں کے عمومی نفع و نقصان سے جس سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں ان کا کوئی لگاؤ نہیں ہے، مثلاً اسمبلیوں کی ممبری بہت سے لوگوں کے لیے عزت و شہرت کا ذریعہ ہے، ان کو ممبر بننے کے بعد کچھ مستقل یا غیر مستقل وظیفے اور الاؤنس وغیرہ بھی ملنے لگتے ہیں جو بہتوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسمبلی کے ممبر ہونے کے بعد پارلیمنٹری سکریٹری یا وزیر وغیرہ بنا لیے جاتے ہیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان فوائد میں سے کوئی فائدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لیے وہ دینی اور دنیاوی فوائد قربان کر دیے جائیں، جو علیحدگی سے پہونچ سکتے ہیں اور جن کی مختصر توضیح اوپر کیجا چکی ہے اور نہ یہ فوائد ان نقصانات کی کسی درجہ میں تلافی کر سکتے ہیں، جو الیکشن میں حصہ لینے سے لازمی طور پر پہونچیں گے اور ان کا دائرہ صرف افراد تک محدود نہیں ہوگا بلکہ وہ پوری اُمّتِ مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے ایسی حالت میں کیا یہ انتہائی حماقت

نہیں ہوگی کہ ہم محدود افراد کے انفرادی فائدوں کی خاطر پوری ملت کے نفع و نقصان سے بے پروا ہو جائیں اور فائدے بھی ایسے کہ کسی باوقار اور غیور قوم کے لیے ان فوائد کو معرض بحث میں لانا بھی درحقیقت اس کی انتہائی ذلت کے مترادف ہے!

نمائندگی کا عذر کچھ لوگ الیکشن کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ممبروں کے ذریعہ اپنی آواز اربابِ اختیار کے کانوں تک پہونچا سکتے ہیں اور اس طرح ان کو اپنے حقوق و مطالبات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، یا اگر کچھ مسلمان وزارت کے عہدوں پر پہونچ جائیں تو وہ اپنے ذاتی اختیارات یا اثر و اقتدار کے ذریعہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ہمارے واجبی حقوق اپنے دائرۂ اختیار کے اندر دلوا سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی بے وزن ہے۔

اول تو ہندوستان کا آئندہ الیکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا، اس لیے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کسی ایسے مسلمان نمائندے کی کامیابی بہت مشتبہ ہے جو اسمبلی میں جاکر واقعی مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے، مخلوط انتخاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوگا بلکہ عام رائے دہندگان کا نمائندہ ہوگا، جس میں اکثریت بہرحال غیر مسلموں کی ہوگی اور اس عمومی نمائندگی کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی شروع امیدواری سے لے کر اسمبلی کی ممبری اور اس کے بحث و مباحثہ اور کسی مسئلہ پر رائے دینے کے ہر مرحلہ پر نہایت شدت کے ساتھ

اپنی اس عمومی حیثیت کو برقرار رکھنا پڑے گا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ اول تو الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکے، یا اگر کامیاب ہو جائے تو اسے اپنی ،، نالائقی ،، کا احساس یا تو اسمبلی کو قبل از وقت چھوڑ دینے پر مجبور کر دے یا پھر اس کو مجسمۂ سکوت بنا دے کہ وہ سب کچھ دیکھتا رہے لیکن کبھی زبان ہلانے کی جرأت نہ کرے اور یہی بات مسلم وزیروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ مسلمان ہونے کی بنا پر وزیر نہیں بنائے جاتے بلکہ پارٹی کے ممبر ہونے کی بنا پر منتخب کیے جاتے ہیں اور ان کے انتخاب میں اس عام اصول کے علاوہ کہ پارٹی کے ساتھ ان کے اخلاص و وفاداری کا کیا درجہ ہے ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر ان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کو ہمیشہ نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں پوری طرح موزوں ثابت ہو سکتے ہیں یا نہیں اور تجربہ بتلاتا ہے کہ مسلمان وزراء ـــــ الا ما شاء اللہ ـــــ اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس معیارِ انتخاب پر پورے اُتریں اور انتخاب کنندگان کو ان کی وجہ سے قوم اور ملک کے سامنے رسوا ہونا نہ پڑے اور وہ اپنی اس کوشش میں اللہ کے فضل سے پوری طرح کامیاب بھی ہیں، یہ لوگ اپنے عام حالات میں سیکولر جمہوری سٹیٹ کے اسی مفہوم کو سامنے نہیں رکھتے ہیں، جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے بلکہ جمہور کے ذہن میں ان الفاظ کا جو مطلب ہے اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام کرتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک اگر مسلمانوں کی کوئی حق تلفی بھی گوارا کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس بات کے لیے تو وہ پوری طرح کوشاں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی لگاؤ کسی طرح ظاہر نہ ہو سکے ورنہ انتخاب کنندگان کی نظرِ انتخاب کی توہین ہو گی

کیا عجب اس کی وجہ سے وہ ان کی نظرِ التفات سے بھی محروم ہو جائیں اور اس طرح مسلمانوں کی "خدمت" کا یہ ذریعہ بھی جاتا رہے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی مسلم وزیروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی شکایات روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہیں اور یہ وزراء ان پر اس طرح خاموش ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے، آپ اِن ہی وزراء پر اپنے مستقبل کے وزراء کو بھی قیاس کر سکتے ہیں، بلکہ اس وقت جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے وہ شاید ویسے بھی ثابت نہ ہو سکیں جیسے اس وقت کے وزراء ہیں اور اس کے وجوہ ظاہر ہیں۔

دوسری بات جو اس ضمن میں اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ خیال سراسر احمقانہ ہے کہ کسی قوم کے حقوق و مطالبات کا تحفظ اس پر موقوف ہے کہ اس کے کچھ لسان القوم ہوں جو اس کی باتیں ارباب اختیار تک پہونچا سکیں اگر ارباب اختیار ایسے ہوتے کہ وہ عرض و معروض کے بغیر ہماری مشکلات و مصائب سے آگاہ نہ ہو سکتے اور ان کا تغافل یا حق تلفی محض اس ناواقفیت کا نتیجہ ہوتی جیسا کہ پچھلے زمانوں میں ہوا کرتا تھا تو یقیناً اس کی ضرورت ہوتی کہ ہم اپنی باتیں ان تک پہونچانے کا کوئی انتظام سوچیں لیکن یہ زمانہ پچھلے زمانوں سے بالکل مختلف ہے، ارباب اختیار جاہل اور ناواقفِ حال لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو ایک ایک بات کی خبر ہے اور ان کے ذرائعِ علم ایسے وسیع ہیں کہ وہ چاہیں تو آپ کی نجی گفتگوؤں کا بھی حال معلوم کر لے سکتے ہیں، اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی شکایات کے ازالہ کے لیے بس اتنی بات کافی ہے کہ کسی طرح وہ ارباب اختیار کے کانوں تک پہونچ سکیں، بلکہ وہ اس بات پر موقوف ہے کہ آپ کے اندر

اپنی بات منوانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر آپ کے معاملات کا فیصلہ اسمبلیوں کے اندر نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے فیصلے کی اصل جگہ اسمبلیوں کے باہر ہے۔ اگر آپ نے اپنی حالت ایسی بنالی کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا وزن محسوس کیا جائے تو چاہے آپ زبان سے کچھ نہ کہیں وہ بات پوری ہو کر رہے گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو چاہے آپ سب کے سب اسمبلیوں میں پہونچکر شور وغل مچائیں سوا ڈانٹ پھٹکار کے آپ کو کچھ میسّر نہیں آئے گا۔ خود کانگریس کی پچھلی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہے، اس کی آواز اس وقت کے ایوانِ اقتدار میں اس وقت سُنی گئی، جب اس نے اسمبلیوں سے باہر رہکر اپنے اندر یہ قوت پیدا کرلی کہ اس کی بات سُنی جائے، ورنہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں اس اصولِ عام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسمبلیوں کا رُخ کیا تو بہت جلد ان کو معلوم ہوگیا کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی شکایات محض اس لیے نہیں ہیں کہ کوئی اس کی بات ان کے کانوں تک پہونچانے والا نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ کچھ اپنی ہی کمزوریوں میں چھپی ہے، پنڈت جی اور ان کے ساتھیوں کی پُرجوش تقریروں سے اکثر ایوانِ اسمبلی لرز اٹھا کرتا تھا، لیکن پرنالہ گرنے کی جو جگہ متعین تھی اس میں ان تقریروں کے ذریعہ سرِمو فرق واقع نہیں ہوتا تھا اور ایک بار کچھ اسی طرح کی غلطی خود کانگریس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کی تھی، یعنی اس نے وزارتوں پر قبضہ کے ذریعہ اپنا کام نکالنا چاہا تھا لیکن اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور بہت جلد اس کو سب کچھ چھوڑ کر اپنے اس میدانِ عمل میں واپس آنا پڑا جہاں کی ہر بات پر دھیان دیا جاتا ہے اور جس کو خالی چھوڑ دینے

سے بڑی سے بڑی آواز میں بھی کوئی قوت نہیں ہوتی ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی دھیان دینے والا ہوتا ہے۔

پس ہمارے نزدیک اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کی آواز واقعی اربابِ اختیار کے کانوں تک پہونچے اور سُنی جائے تو اس کی حقیقی تدبیر یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی آواز ایسے گراموفونوں میں بند کرنے کی کوشش کریں جو اپنی مرضی سے بول بھی نہ سکتے ہوں اس طرح کے گراموفون، لوگوں کی تفریح کا ذریعہ تو ضرور بن سکتے ہیں لیکن ان کی آواز اربابِ کار کو آپ کے حقوق و مطالبات کی طرف متوجہ نہیں کر سکتی، اس کے لیے آپ کو اس کے ماسوا کچھ کرنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھیے کہ یہ طریقِ عمل بعینہ وہی طریق عمل ہے جو اب تک مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اختیار کرتے رہے ہیں، لیکن جس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے۔ ہندوستان میں ایک عرصہ سے مسلمانوں کی سیاست کا محور یہی رہا ہے کہ وہ کس طرح اسمبلیوں میں زیادہ سے زیادہ حقِ نمائندگی حاصل کریں، اور وزارتوں میں ان کا زیادہ سے زیادہ حصّہ ہو، اس کی خاطر انھوں نے خوشامدوں کی ذلّت بھی گوارا کی اور مخالفتوں اور لڑائیوں کا خطرہ بھی مول لیا، اور بالآخر اس مقصد میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، چنانچہ تقسیم سے پہلے ان کو غیر منقسم ہندوستان کی وزارتوں اور اسمبلیوں کی ممبری کا اس سے زیادہ حصّہ حاصل رہا ہے، جس کے وہ اپنے تناسبِ آبادی کے لحاظ سے مستحق ہو سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ باتیں ان کے دکھ کا درماں نہیں بن سکیں، اور ہر کامیابی کے بعد ان کو پہلے

سے زیادہ اپنی ناکامی کا احساس ہوتا گیا تاآنکہ آخری چارۂ کار ان کو یہی نظر آیا کہ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ مامن پاکستان کی شکل میں حاصل کریں۔ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لیے خیر و برکت کا موجب ثابت ہوا، یا اس سے ان کے قومی مسائل اور زیادہ الجھ گئے ہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے، جس سے یہاں تعرض کی ضرورت نہیں لیکن اس سے کم از کم یہ بات واضح ہے کہ وزارتیں اور ممبریاں اس ملک میں جہاں ان کی حیثیت ایک نہایت کمزور اقلیت کی ہو کوئی زیادہ سود مند چیز نہیں ہے تو کیا ہندوستان کے مسلمان اسی آزمائے ہوئے نسخہ پر زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے یہ تدبیر اس وقت بھی صحیح اور کارگر نہیں تھی لیکن اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس تدبیر کا سہارا ڈھونڈنا صداقت کو بالکلیہ ترک کر دینا چاہیے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی مطلق گنجائش نہیں ہے، اس زمانہ میں قومی حقوق و مطالبات پر زور دینا اور وہ بھی قوم پرستانہ طریقوں کے ذریعہ، یہ ان حقوق کو پامال کرنے کے مترادف ہے، ان کے لیے صحیح بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اب اپنا صحیح مقام سمجھتے ہوئے خود ہی اپنے قومی حقوق و مطالبات کی فہرست پر نظر ڈالیں اور جو باتیں ان کی اصلی حیثیت کے مطابق ہیں ان کو پوری قوت سے برقرار رکھنے کی کوشش کریں اور بقیہ کو نظر انداز کریں لیکن اگر ابھی ان پر اپنی اصل حیثیت واضح نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی موجودہ حیثیت ہی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں اپنے حقوق و مطالبات کے منوانے کے لیے کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے، یہ اسمبلیوں کی نمائندگی تو اس کے لیے کچھ سود مند نہیں ہے۔

خطرات سے تحفظ کا فریب

الیکشن سے علیحدگی کا ایک اور زبردست نقصان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں کوئی ایسی پارٹی برسرِ اقتدار آجائے گی جو مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی اور اس وقت مسلمانوں کو جو سہولتیں اور آزادیاں حاصل ہیں وہ بھی اس کے تحت ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کو پوری قوت و ہمّت کے ساتھ حصہ لینا چاہیے اور ان پارٹیوں میں سے نسبتاً کسی بہتر یا کم خطرناک پارٹی کو منتخب کرکے اس کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

الیکشن کی حمایت میں اس وقت جتنی دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں مذکورہ بالا دلیل اس اعتبار سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے کہ اس کا مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ پر بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے لیکن اس کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ اس دلیل میں کوئی وزن ہے، وزن تو کیا فی نفسہ یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے جیسا کہ آپ کو آئندہ بتایا جائے گا، البتہ چونکہ یہ دلیل خوف زدہ مسلمانوں کی ذہنیت سے مطابقت رکھتی ہے اس لیے اس طرح کے مسلمانوں پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑنا ناگزیر ہے۔

تقسیم کے بعد سے اس وقت تک مسلمان مختلف قسم کی آفات و مصائب کے شکار رہے ہیں اور آئندہ بھی ان کو اپنے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی پڑ رہا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے اپنی کم نگاہی یا بدحواسی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا ہے ــــ اور بدقسمتی سے یہی عام طور سے ان کو سمجھایا بھی جاتا ہے۔ کہ ان کو جو کچھ بھی مصیبتیں ہندوستان میں پیش آرہی ہیں وہ محض یہاں کی بعض پارٹیوں کے

غلط طرزِ عمل کا نتیجہ ہیں اور ان کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے کہ وہ انہی پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کے دامنِ عطوفت میں پناہ لیں، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ خوف زدہ مسلمان امن وسکون کی تلاش میں ہر اس راستہ پر دوڑ پڑیں جس کو ان کے نجات کا راستہ قرار دیا جائے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی راستہ محض ظن وگمان کی بنا پر امن وسکون کا راستہ نہیں بن جائے گا اور نہ ان کی خوش گمانیوں سے اس کی خطرناکیاں ان کے حق میں راحت وسکون کا ذریعہ بن جائیں گی بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی اس سراسیمگی اور سرگشتگی کی حالت میں کسی ایسے راستے کو اپنے لیے راہِ نجات فرض کر لیں جس پر چل کر ان کی مصیبت ختم ہونے کی بجائے اور زیادہ سخت اور سنگین ہو جائے اور پھر بعد کو ان کو سوا پچھتانے کے اور کچھ حاصل نہ ہو سکے۔

ہمارے نزدیک الیکشن میں حصّہ لے کر کسی بہتر پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے کی کوشش کی بھی حیثیت یہی ہے۔ یہ ان کی بدحواسی کا سوچا ہوا نسخہ ہے اور اس سے فائدہ کی بجائے اُن کو اور زیادہ الٹا نقصان پہنچنے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ الیکشن میں حصّہ نہ لینا اگر اس پہلو سے خطرناک ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم کسی خطرناک پارٹی کے زیرِ اقتدار آ جائیں گے اور یہ خطرہ ہمارے لیے بہت سے خطرات کا پیش خیمہ ہے۔ تو ہمارے نزدیک فی نفسہ الیکشن میں حصّہ لینے سے جو خطرات پیش آئیں گے وہ ان خطرات سے

بدرجہا زیادہ خطرناک ہیں اس لیے اگر آپ خطرات سے اپنا تحفظ چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے آپ الیکشن میں حصّہ لینا چاہتے ہیں —— دراں حالیکہ اس کی شرعی اور دینی حیثیت آپ پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں ہے —— تو آپ اس خطرہ کے نقطۂ نظر ہی کے تحت فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کے لیے الیکشن میں حصّہ لینا زیادہ مفید ہوگا یا اس سے علیحدہ رہنا۔

الیکشن میں شرکت کے نقصانات ہم اس سے پہلے تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اس موقع پر ان کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

(۲) دوسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسا ہو بھی کہ ہمارے موجودہ خطرات ومصائب کا علاج یہی ہو کہ ہم موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک کی امداد حاصل کریں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کونسی پارٹی ایسی ہوسکتی ہے جس کو ہم اس حیثیت سے منتخب کریں؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اس وقت ہم عام ملکی مصالح ومفاد کے پیشِ نظر ان پارٹیوں کے فرق وامتیاز پر غور نہیں کر رہے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہم خود بڑی آسانی کے ساتھ کسی ایک پارٹی کے حق میں اپنی رائے ظاہر کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ اس حیثیت سے ان میں باہم فرق وامتیاز پایا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مختلف اعتبارات کے سامنے رکھنے کی وجہ سے لوگ اس بارے میں مختلف الرائے ہوں، جیسا کہ اس وقت ہے —— ہم تو ان پارٹیوں پر اس وقت اس حیثیت سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس میں سے کون سی

پارٹی مسلمانوں کے لیے ان کے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت قابلِ ترجیح ہوسکتی ہے، اور اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد کم از کم ہمارے لیے ان میں فرق و امتیاز کرنا بہت دشوار ہے۔

الیکشن جب قریب آئے گا اور اس میں مسلمان عملاً حصّہ لیں گے تو اس وقت کیا ہوگا، اس کو ابھی جانے دیجیئے کہ یہ آئندہ سے متعلق سوال ہے جس کے بارے میں ہم اور آپ جو کچھ کہیں گے وہ بہر صورت از قبیل ظن و قیاس ہی ہوگا جس میں بحث کی کافی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس کے سلسلہ میں تو ظن و قیاس سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ایک قطعی چیز ہے اس لیے اس پر غور کرنے کے بعد بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ پارٹیاں کیا ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ و مسلک کیا ہے اور ان کی اب تک کی کارروائیاں مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ثابت ہوچکی ہیں۔

وہ پارٹیاں جن کو مسلمانوں کی طرزِ عمل سے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ یہ محض ان کے ساتھ لگاؤ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس وقت ان کی حریف جماعتوں کے طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ ان کا بھی حال یہ ہے کہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی ان کے اندر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی

کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو رہا ہے دراں حالیکہ ان پارٹیوں میں بعض ایسی ہیں جن کے کندھوں پر اس وقت ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کا بجائے خود یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ ملک میں امن و امان قائم کریں، اور بلا امتیاز مذہب و ملت ہر قوم کو عدل و انصاف کے قوانین سے یکساں طور سے مستفید ہونے کا موقع دیں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آج مسلمان ہندوستان میں طرح طرح کے مظالم کے ہاتھوں اس طرح پریشاں ہیں کہ انھیں اپنی بدحواسی کی حالت میں اپنے لیے کوئی راہِ نجات بھی سوجھائی نہیں دیتی ہے، سوائے اس کے کہ وہ ہنسی خوشی اپنے کو موت کے آغوش میں ڈال دیں اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ان کے ہمدردوں کی ہمدردی جنبش میں نہیں آتی ہے تو اس حالت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ آئندہ آپ کو ان کی ہمدردیاں حاصل ہو سکیں گی اور آپ اس کی وجہ سے ہر فکر سے نچنت ہو جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان جن پارٹیوں کو اپنے سہارے کے لیے اُمید کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں خود ایسے لوگ گھسے ہوئے ہیں بلکہ ان کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہیں جن کی طبعی خواہش یہی ہے کہ مسلمان اگر ان کے ہاتھوں نہیں ــ کیوں کہ یہ ان کی یا ان کی پارٹی کی بدنامی کا باعث ہوگا ـــــ تو دوسروں کے ہاتھوں ستائے اور دبائے جائیں تاکہ مسلمانوں کو ذلیل و خوار دیکھ کر خود ان کے دل کو تسکین ہو یا مسلمانوں میں احساسِ عجز و بے چارگی پیدا ہو تاکہ وہ ان کو اپنے پارٹی کے مقاصد کے تحت جس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اس کے لیے

راستہ ہموار ہو جائے۔

اور ان پارٹیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو مسلمانوں کا اس طرح تختۂ مشق بننا دل سے تو پسند نہیں ہے لیکن وہ اس پر اس لیے خاموش ہیں کہ ان مقہورین کی حمایت کے جرم میں وہ یا ان کی جماعت پبلک میں بدنام نہ ہو جائے جس کے ووٹوں ہی پر اُن کی آئندہ کامیابی و کامرانی کا دار و مدار ہے۔

اور ایک تیسری وجہ ان کی خاموشی اور تحمل کی یہ بھی ہے کہ ان پارٹیوں کے ذمہ دار لوگوں کو بہر صورت یہ اطمینان ہے کہ مسلمانوں کا ووٹ ان کے سوا اور کسی کو نہیں مل سکے گا، بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مسلمان دوسری پارٹیوں کی طرف سے جتنا زیادہ ستائے جائیں گے اتنا ہی زیادہ وہ ان کے قریب ہوں گے کیوں کہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس وقت اس حالت میں پہنچ گئے ہیں کہ ان کو ان کے سوا اور کوئی دوسرا سہارا نظر نہیں آتا ہے، اس لیے وہ ہر طرف سے پریشان ہو کر اور زیادہ شدت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ ایک جمہوری نظامِ آئین نافذ ہے جو اپنی ظاہری ہیئت میں بہت شاندار اور یہاں کی اقلیتوں کے لیے بہت اطمینان بخش نظر آتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوام اپنے مزاج و ذہنیت کے اعتبار سے ابھی جمہوریت سے کوسوں دور ہیں، اور یہ پارٹیاں ایسے ہی جمہور کا مرکب یا اس کی نمائندہ ہیں، اس لیے وہ ابھی تک عوامی جذبات سے بالاتر نہیں ہو سکی ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ عوام کے اس مزاج و ذہنیت

کی تبدیلی کا اس وقت کوئی سامان بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں کو اس ذہنیت سے خاص طور سے نقصان پہونچ رہا ہے، وہ بھی اس کی اصلاح میں اپنا واجبی حصہ ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اس میں تبدیلی کرنے کی بجائے اپنے لیے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کو علی حالہٖ چھوڑ کر اس سے تحفظ کے لیے اپنی تدابیر اختیار کریں، خواہ یہ تدابیر ایسی ہی کیوں نہ ہوں جو ایسی ذہنیت کو اور زیادہ ہوا دینے والی ثابت ہوں۔ یہی غلطی مسلمان ایک عرصے سے کرتے چلے آرہے ہیں اور اب اس کا تلخ خمیازہ بھگتنے کے بعد بھی وہ اصل مرض کا علاج سوچنے کی بجائے ایسی ہی تدابیر اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

بہرحال یہ الگ بحث ہے، اس وقت کہنا یہ ہے کہ جب ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں کی اصل حیثیت یہ ہے کہ ہم ان میں سے کسی سے بھی اپنی پریشانیوں میں کسی خاص امداد کی توقع نہیں کر سکتے، تو پھر ہمارے لیے یہ سوال کیا اہمیت رکھتا ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان میں سے کون سی پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے، جو پارٹی بھی کامیاب ہو، کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ ہمارے لیے یکساں مفید یا یکساں مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں اس وقت بظاہر کوئی فرق بھی ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ فرق اس بات کا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ پارٹیاں ایسی ہیں جو فی الحال اقتدار کی مالک ہیں اور ان کے کندھوں پر ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داریاں ہیں، اور دوسری پارٹیاں وہ ہیں جو اقتدار سے محروم ہیں اور اس کے لیے وہ کوشاں ہیں، یہ فرق خود ان میں مختلف حیثیتوں سے فرق کا موجب ہے، اس لیے

یہ ناممکن نہیں ہے کہ اگر آئندہ الیکشن میں برسرِ اقتدار پارٹیاں اقتدار سے محروم اور محروم پارٹیاں برسرِ اقتدار آجائیں تو اس تبدیلی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ضمن میں ان کا موجودہ رجحان و رویہ بھی بدل جائے، ایسی حالت میں کسی پارٹی کے ساتھ ہر طرح کی اُمیدیں وابستہ کرلینا اور دوسری سے بالکلیہ مایوس ہوجانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

ان باتوں کو سامنے رکھ کر آپ خود غور فرمائیں کہ آپ اپنی محبوب پارٹیوں کی حمایت و امداد کی توقع پر اپنے مخالفین کو اور زیادہ برگشتہ کرنے کا جو کھیل کھیلنا چاہتے ہیں وہ کہاں تک آپ کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

ہمارے نزدیک تو یہ سہارا نہایت بودا سہارا ہے اور اس کے اعتماد پر الیکشن میں حصہ لینا، انتہائی خطرناک بات ہے، اس لیے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس اعتماد پر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے، خطرات و مصائب سے نجات اس ذریعہ سے ممکن نہیں ہے، اس کے لیے کوئی دوسری ہی راہ اختیار کرنی ہوگی جس کا پہلا قدم الیکشن سے علیحدگی ہے جو انشاء اللہ اس خطرہ کے پہلو سے بھی مفید ثابت ہوگا، کیونکہ اس سے ایک طرف مخالف پارٹیوں کا جذبۂ عناد کچھ نہ کچھ کم ہوگا یا کم از کم اس میں شدت پیدا نہیں ہوسکے گی اور دوسری طرف اس سے ان کے "دوستوں" کا جذبۂ ہمدردی بھی شاید کوئی عملی شکل اختیار کرسکے کیوں کہ اس سے ان کا یہ اعتماد یقینی طور سے متاثر ہوگا کہ مسلمان ہر حال میں ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں اور اس کے بعد یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ از سرِ نو مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ فائدہ

آپ کے نقطۂ نظر سے آپ کے لیے بہت قیمتی ہو سکتا ہے اور ان دونوں فائدوں کے علاوہ اس سے ایک اور زبردست فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں عام پبلک کا غصہ کچھ فرو ہو سکتا ہے جو خواہ مخواہ اس سے برہم ہوتی ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ حقوق کے لیے کشمکش کر رہے ہیں۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ ان کی برہمی ہمارے لیے دو گونہ مصیبت کا باعث ہے، مخالفین اس کو ہماری مخالفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور موافقین اس کی موجودگی میں ہمارے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے سے ہچکچاتے ہیں، بلکہ اکثر حالتوں میں ان کے جذبات میں ان کا عملاً ساتھ دیتے ہیں کیونکہ ان کو چھوڑ کر کوئی پارٹی نہ اقتدار حاصل کر سکتی ہے اور نہ اقتدار پر تادیر متمکن رہ سکتی ہے۔

(۳) تیسری بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان پارٹیوں میں ہماری ہمدردی یا مخالفت کے اعتبار سے باہم فرقِ مراتب پایا جاتا ہے، اور یہ ہمارے لیے بہت زیادہ قابلِ لحاظ ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئندہ الیکشن میں کسی پارٹی کی کامیابی یا ناکامی محض آپ کی تائید یا مخالفت پر منحصر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آپ الیکشن میں حصہ لے کر کچھ دنیاوی فائدے حاصل کر سکتے تھے، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ایسا نہیں ہے مسلمانوں کی تعداد بلاشبہ ہندوستان میں۔ . . . اب بھی بہت زیادہ ہے، لیکن یہ تعداد کہیں اکٹھی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اگر وہ سب مل کر بھی چاہیں کہ کسی ایک امیدوار کو الیکشن میں کامیاب بنا دیں تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں، کیونکہ ہندوستان کا

آئندہ الیکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسی نشست ہو جہاں مسلم ووٹروں کی تعداد کوئی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو، غیر مسلم ووٹروں کی ہر جگہ اکثریت ہے اور یہی فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے آپ کی شرکت یا علیحدگی کا الیکشن کے عام نتائج پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ کی شرکت سے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ آپ جس پارٹی کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں وہ ناکام ہو جائے اور جس کی ناکامیابی کے متوقع ہیں وہ کامیاب ہو جائے کیوں کہ مسلمانوں کی کسی امیدوار کی حمایت موجودہ حالات میں اس بات کی دلیل سمجھی جائے گی کہ وہ "نالائق" ہے اور اکثریت اس کی مخالفت پر تل جائے گی۔ گویا اس طرح الیکشن میں حصہ لے کر مسلمان اپنے کو بھی نقصان پہونچائیں گے اور اس پارٹی کو بھی جس کو وہ کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

پھر مصیبت تنہا یہی نہیں ہے کہ مسلمان اس طرح ظاہری طور سے بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یک جہتی موجود نہیں ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ظاہری طور سے منتشر ہوتے ہوئے بھی اپنی معتد بہ تعداد کے ذریعہ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتے تھے، لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ وہ کسی ایک نقطہ پر نہ مجتمع ہیں اور نہ مجتمع ہو سکتے ہیں حبل اللہ المتین کو چھوڑ کر وہ مختلف احزاب میں تقسیم ہو گئے ہیں، ہندوستان کی کون سی پارٹی ایسی ہے جس میں مسلمان شریک نہ ہوں، حد یہ ہے کہ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق

بہت سے مسلمان مہاسبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں تاکہ آئندہ الیکشن میں اس کو کامیاب بنائیں، گویا مسلمان کی حیثیت ہی اس وقت یہ ہو گئی ہے کہ اس کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ اس کا کوئی مخصوص مطمح نظر، وہ ہر اس پارٹی کا ممبر ہو سکتا ہے جس کی ممبری اس کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ اس کے خیال کے مطابق کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہونچ سکے، پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس آخر وہ کون سا آلہ ہے جس کو استعمال کرنے کے بعد آپ یہ توقع رکھ سکتے ہوں کہ تمام مسلمان آئندہ الیکشن میں صرف اس پارٹی کا ساتھ دیں گے جس کو آپنے مسلمانوں کے حق میں بہتر یا کم خطرناک سمجھ کر اپنی تائید کے لیے منتخب کیا ہو؟ اور اگر آپ کا منشا یہ ہو کہ چاہے مسلمان متفق ہوں یا نہ ہوں، جو لوگ کسی پارٹی کو اس نقطۂ نظر سے بہتر سمجھتے ہوں، انھیں اپنی حد تک اس کی تائید کرنی چاہیے تو بلاشبہ آپ کو اس کا حق حاصل ہے اور ہم خود اس اصول کے قائل ہیں کہ ہمیں اپنے عمل کی بنیاد خود اپنے ذاتی فکر و عقیدہ پر رکھنی چاہیے اور اس کے بارے میں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اس میں ہمارا ساتھ دینے والے کتنے ہیں، لیکن اس کے بعد آپ کو یہ دلیل پیش کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا کہ آپ کا پسند کیا ہوا یہ طریقہ مسلمانوں کے لیے خطرات کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے مفید بھی ہے، کیونکہ یہاں جس فائدہ پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان سب کے سب یا ان کی اکثریت اس پر متفق ہو، صرف اس صورت میں آپ کسی بہتر پارٹی کو کامیاب

بنانے میں کچھ مفید ثابت ہو سکتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو پھر الیکشن میں مسلمانوں کی شرکت سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ان کی قوتیں رائگاں جائیں، ان کا انتشار اور زیادہ بڑھے اور نمایاں ہو، مخالفین کا جوشِ مخالفت اور زیادہ ترقی کرے، اور کوئی ایک پارٹی بھی ان سے زیادہ خوش نہ ہو سکے، اور اگر آپ مسلمانوں کی اس انتشار کی کیفیت کے باوجود اس اعتماد پر الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں کہ یہ پارٹیاں تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى کی مصداق ہیں اور ایسی حالت میں مسلمانوں کی تھوڑی سی جمعیت بھی الیکشن کے نتیجہ کو ان کے حق میں موڑ سکتی ہے تو یہ بات صحیح ہو سکتی تھی، لیکن ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان بھی ان ہی کی طرح منتشر اور پراگندہ نہ ہوتے، بلکہ جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے، ان کی حیثیت "بنیانِ مرصوص" یا "جسدِ واحد" کی ہوتی اور وہ سب مل کر کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت کرتے ہوتے۔ موجودہ حالت میں جب کہ یہ ان سے بھی زیادہ انتشار میں خود مبتلا ہیں اور اس کے ساتھ ہی بدحواسی نے ان کو تدبیر و حکمت سے بھی کوسوں دور پھینک دیا ہے، یہ توقع رکھنا انتہائی سادہ لوحی کی بات ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ ان پارٹیوں کی یہ باہمی چپقلش ان کے لیے کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو، اس سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے، اول تو وہ آپس میں کتنا ہی لڑیں بھڑیں، وہ آپ کو اپنے قریب آنے دینے کی روادار نہیں ہیں بشرطیکہ آپ فی الواقع

اپنے کو مٹا کر ان کے جسم کا جزء نہ بن جائیں اور اگر آپ قریب جانے کا کوئی موقع نکال بھی لیں تو یہ لڑائی بھڑائی آپ کے لیے اس حیثیت سے بالکل بے معنی ہے کہ اس میں جو پارٹی بھی کامیاب ہوگی وہ کوئی آپ کی پارٹی نہیں ہو سکتی، وہ انھیں پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی ہوگی اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کے دکھ کا مداوا نہیں ہے۔

بزدلی کا طعنہ

اوپر جو باتیں ہم نے پیش کی ہیں ان کے ضمن میں بہت سے لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ کسی ایک یا متعدد جماعتوں کی چیرہ دستیوں کے اندیشہ سے الیکشن سے علیحدہ رہنا خوف اور بزدلی کی راہ ہے جو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی اور پھر وہ ایک خاص مجاہدانہ انداز میں تقریر کرتے ہیں کہ کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کو خطرات میں ڈالے کہ یہی اصل زندگی ہے یا اس کے ذریعہ زندگی کی راہیں کھلتی ہیں اور علیحدگی جمود کا پیش خیمہ ہے جس کی حیثیت قوموں کے لیے موت کی ہے

اس کے جواب میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ان باتوں سے ہمیں سونی صد اتفاق ہے، لیکن یہ باتیں بنانے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جو دلیل وہ پیش کر رہے ہیں وہ بھی تو خوف و بزدلی ہی پر مبنی ہے، اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ الیکشن میں حصہ لینا آپ کے دین اور آپ کی ملی حیثیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، آپ الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ خود آپ کے بقول یہی تو ہے کہ اس سے کسی خطرناک پارٹی کے برسرِ اقتدار آجانے کا اندیشہ ہے - - - - - - - - - - - - - - -

.... تو پھر آخر الیکشن سے علیحدہ رہنے کو آپ خوف و بزدلی کے عذر کی بنا پر کیوں کر رد کر سکتے ہیں۔ اگر اس پہلو سے یہ دو نوں راہیں یکساں درجہ رکھتی ہیں تو پھر مدار بحث صرف یہی بات ہو سکتی ہے کہ ان دونوں راہوں میں کون سی راہ ایسی ہے جس کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کو کم سے کم خطرہ پیش آسکتا ہے۔ یا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ خطرات سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور جہاں تک آپ کی تجویز کردہ راہ کا تعلق ہے یہ بات اوپر کی بحث سے بھی یک گونہ واضح ہو گئی ہے اور آئندہ آپ کو اس کے سلسلہ میں مزید معلوم ہو گا کہ وہ نہ کسی پہلو سے ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کسی خطرہ ہی کا ازالہ ہو سکتا ہے اور اس کے برعکس ہم جس راہ کے داعی ہیں اس کا یہ فائدہ تو بین طور سے ہر حال میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ چاہے اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن اس سے مختلف مصیبتوں کا سدِ باب ہو جاتا ہے، اور اگر فی الواقع آپ حرکت و سعی کی زندگی ہی کے طالب ہیں تو آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم الیکشن سے علیحدگی کا جو مشورہ دے رہے ہیں وہ بس علیحدگی پر ختم ہو جائے گا، ہمارے نزدیک تو یہ کام کا ایک منفی پہلو ہے اور حقیقی کام جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اس کی حد اس علیحدگی کے بعد شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ کام ایسا ہے جس میں آپ کو اپنی حوصلہ مندیاں دکھانے کا کافی موقع مل سکتا ہے، اس لیے اگر آپ کو ترک وجود کی زندگی پسند نہیں ہے اور اس بنا پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو تھوڑا صبر کر کے پہلے ہمارے پیش نظر کام کا ایک سرسری جائزہ لے لیجیے اگر اس سے آپ کے ذوق کار کی تسکین ہو سکے تو ہمارے

نزدیک اسی کو اختیار کرنا آپ کے لیے مناسب ہوگا کیونکہ وہ کام دینی حیثیت سے بھی آپ کے کرنے کا ہے اور ہمارے نزدیک آپ کی دنیا بھی اسی سے محفوظ ہو سکتی ہے اور کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ کوئی کام جس سے نہ دین کا کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہو اور نہ دُنیا کا محض اس لیے کیا جائے کہ آپ کی بے چینی آپ کو کوئی کام کرنے پر مجبور کر رہی ہے، جمود و بے عملی بلاشبہ بہت بُری چیز ہے، لیکن ایسی سعی و عمل سے تو وہ بہر حال پسندیدہ ہے جو غلط جگہ اور بے جا طور پر صرف ہو اور جس کا نتیجہ کھلے طور پر فائدہ کی بجائے سراسر نقصان ہو۔

ان نقصانات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے بعض لوگ کچھ اور نقصانات کا نام بھی لیا کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ نقصانات کچھ زیادہ لائقِ توجہ یا قابلِ بحث نہیں ہیں، اس لیے ہم ان پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے، البتہ ان کا سرسری تذکرہ یہاں اس لیے کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ مسلمان اس وقت کس ذہنی ابتری اور انتشار کے شکار ہیں۔

ناخوشی کا اندیشہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الیکشن سے مسلمانوں کی علیحدگی ان پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی جن کا مسلمان اب تک ساتھ دیتے آئے ہیں، اس لیے چاہے ان کا ساتھ دینے سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ان کی مروّت کے منافی بات ہے کہ وہ الیکشن جیسے نازک موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

کا موجب نہیں ہوگی، بلکہ بحیثیت مجموعی تمام پارٹیاں اس سے ناراض ہوجائیں گی. اور یہ چیز مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہوسکتی، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے، ہندوستان کی کتنی ہی پارٹیاں ہیں جو مسلمانوں کی علیحدگی کو اپنے لیے مفید سمجھیں گی اور اس بنا پر وہ نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں ہوں گی بلکہ خوش ہوں گی اور ان کی خوشی یا ناخوشی سے قطع نظر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے ہمیں اپنے رویہ کی بنیاد انتی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں رکھنی چاہیے۔ ہمیں بحیثیت مجموعی اپنے مفاد و مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس کے مطابق اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا چاہیے، خواہ اس سے کسی کو کتنا ہی دکھ کیوں نہ پہونچے اور اس کی وجہ سے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں، کوئی قوم دوسروں کی خوشی یا ناخوشی کے ساتھ اپنی موت و زیست کو وابستہ نہیں کرسکتی اور اگر کوئی قوم ایسا کرے تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

تفریق کا فائدہ کچھ لوگ الیکشن سے علیحدگی کا یہ نقصان بتاتے ہیں کہ الیکشن نے ہمارے لیے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم ان پارٹیوں میں گھس کر ان کو ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان کرسکیں۔ اس لیے اگر ہم اس قیمتی موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ بڑے نقصان کی بات ہوگی، یہ دلیل ہمارے نزدیک انتہائی سفاہت پر مبنی ہے اگر یہ چیز ممکن ہو بھی تو یہ کسی طرح ہمارے شایان شان نہیں ہے، پہلی بات یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی بدبختی پر اپنا مستقبل تعمیر نہیں کرسکتی، اس کے لیے ٹھوس بنیادیں

درکار ہیں - اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں یہاں کی عام خوش بختی اور بد بختی سے الگ ہو کر اپنے لیے کسی خوش بختی کی توقع نہیں کر سکتے جو چیز یہاں کی عام آبادی پر بُرا اثر ڈال سکتی ہے اس کے اثرات سے ہم اپنے کو بھی محفوظ نہیں کر سکتے ہیں، اس لیے جو لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں وہ ملک ہی کے دشمن نہیں ہیں بلکہ اپنی قوم اور خود اپنے بھی دشمن ہیں، بعض لوگوں کی زبانی اس طرح کی دلیلیں سُن کر ہمیں مسلمانوں کی حالت پر انتہائی قلق ہوتا ہے - ان کے نادان لوگ اپنے غم و غصہ کی شدّت میں عقل و ہوش کی تمام حدود کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اور یہ حالت انتہائی تباہ کن ہے -

بہر حال یہ اور اسی طرح کی دلیلیں اس وقت الیکشن سے علیحدگی کے نقصانات کے ضمن میں پیش کی جاتی ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ نے گزشتہ تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہو گا کہ یہ ہمارے لیے کہاں تک قابلِ قبول یا لائق اعتنا ہو سکتی ہیں -

اس بحث سے فارغ ہونے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ الیکشن سے علیحدگی کے بعد ہمارا دوسرا قدم کیا ہونا چاہیے - اِس کے لیے اس رسالہ کا حصّہ دوم " مسلمانانِ ہند کا لائحہ عمل " کے نام سے علیحدہ شائع ہو رہا ہے ملاحظہ فرمائیے -

ہمارا

اگلا اشاعتی پروگرام

(۱) "مسلمانانِ ہند کا لائحہ عمل" از مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی۔
(یعنی مسئلہ انتخابات حصہ دوم)

(۲) "حق و باطل" از جناب ابوالسلام نعیم صدیقی۔

(۳) "روئداد اجتماع رام پور" (شعبہ تنظیم جماعت)

(۴) "اساسِ دین کی تعمیر" از مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی۔

(۵) "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ"
"

مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور۔ یو۔ پی